سلسلۂ اسلام اور مستشرقین

فروری سنہ ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر دارالمصنفین کے اہتمام میں جو بین الاقوامی سیمینار ہوا تھا، اس کے سلسلہ میں اسی عنوان پر دارالمصنفین نے ایک اہم اور نیا سلسلۂ تالیفات شروع کیا ہے جس کی اب تک پانچ جلدیں مرتب ہو چکی ہیں۔

جلد ۱ اس میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے قلم سے اس سمینار کی بہت ہی مفصل اور دلچسپ روداد قلم بند ہوئی ہے۔ قیمت ۲۰ روپے۔

جلد ۲ اس میں وہ تمام مقالات جمع کر دیے گئے ہیں جو اس سیمینار میں پڑھے گئے تھے اور جو معارف سنہ ۸۲ء سے لے کر ۸۳ء تک سلسلہ وار شایع بھی ہو چکے ہیں۔ قیمت ۳۴ روپے

جلد ۳ اس میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر سمینار کے علاوہ جو مقالات لکھے گئے ہیں، اور معارف میں شایع بھی ہو چکے ہیں، جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۲ روپے۔

جلد ۴ تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں علامہ شبلی نعمانیؒ کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۲ روپے۔

جلد ۵ اسلامی علوم و فنون سے متعلق مستشرقین کی قابل قدر خدمات کے اعتراف کے بعد ان کے اسلام اور تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اعتراضات کے جواب میں مولانا سید سلیمان ندوی کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۲۰ روپے۔

"منیجر"

جلد ۱۴۴ ماہ محرم الحرام سنہ ۱۴۱۰ھ مطابق ماہ اگست سنہ ۱۹۸۹ء عدد ۲

مضامین

شذرات

ہندوستان ایک وسیع و عریض ملک ہے، اس میں مختلف رنگ و نسل کے لوگ آباد ہیں، جن کا نہ مذہب ایک ہے اور نہ ان کی تہذیب و معاشرت، اور زبان ہی ایک ہے مگر ان کے سیاسی، اقتصادی اور سماجی مسائل یکساں نوعیت کے ہیں، اس لئے ان مختلف مذہبی، لسانی، تہذیبی اور نسلی گروہوں میں اتحاد و یک جہتی ضروری ہے تاکہ کثرت میں بھی وحدت کا جلوہ ہو، جس طرح ایک ماں باپ کی اولاد یا ایک خاندان کے افراد کی شکل و صورت، قد و قامت اور ذوق و طبیعت میں اختلاف ہوتا ہے، ان کی ذہنی اور عملی صلاحیتوں میں فرق ہوتا ہے اور ان کے جذبات و میلانات اور افکار و خیالات بھی یکساں نہیں ہوتے مگر اس کے باوجود وہ متحد ہوتے ہیں اور اپنے گھر اور خاندان کی ترقی و تحفظ میں حصہ لیتے ہیں اور اس کی عزت و نیک نامی پر آنچ نہیں آنے دیتے، اسی طرح ہندوستان کے مختلف عقیدہ و مذہب کے ماننے والوں کو بھی متحد ہو کر ملک کی ترقی و استحکام اور اس کی عظمت و وقار بڑھانے کے لئے سرگرم عمل رہنا چاہئے۔

لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے، جب ان مختلف الخیال اور متضاد عناصر میں میل جول اور اتفاق ہو اور وہ تصادم اور ٹکراؤ سے بچیں، مختلف گروہوں اور علاقوں کی اپنی اپنی انفرادی خصوصیات کے باوجود ملک کے تمام باشندے اپنے کو ہندوستانی اور ایک قوم سمجھیں کیونکہ وہ ہندوستانی قومیت کے اعتبار سے بھائی بھائی اور ایک ایسے رشتہ میں منسلک ہیں جو خون کے رشتے سے بھی زیادہ مضبوط ہے، ہمارے ملک کی اصل روح سیکولر ہندوستانیت ہے اس لئے اس میں بسنے والی ہندوستانی قوم کو سیکولر اور جمہوری ہندوستان کی تعمیر و تشکیل میں پورا حصہ لینا چاہئے اور یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب سارے مذہبی فرقے، مختلف تہذیبی و لسانی گروہ اور ہر علاقہ کے لوگ سیاسی، معاشی اور سماجی حیثیت سے مساوی ہوں یا کم از کم سب کو بڑھنے اور ترقی کرنے

کا یکساں موقع ملے کیوں کہ اس کے بغیر وہ ملک کی مشترکہ جد و جہد میں اپنا پورا حق ادا نہیں کر سکتے بلکہ زیادہ ترقی یافتہ اور مضبوط مذہبی و لسانی گروہ اپنے غیر معمولی اثر سے ان کے وجود ہی کو خطرے میں ڈال دے گا اور وہ اس کا جزبن کر رہ جائیں گے مگر یہ صورت سیکولر اور جمہوری ہندوستان کے آئین و روح کے سراسر منافی ہوگی، اسی لئے دنیا کی تمام جمہوری حکومتوں میں اس کے تمام باشندوں اور مختلف طبقوں کے تحفظ کی ضمانت ہوتی ہے جو ہندوستان کے دستور کی بھی مسلمہ خوبی ہے۔

ہندوستان کی سیکولر اور جمہوری حکومت کو بھی ملک کے مختلف علاقوں، ہر رنگ و نسل کے لوگوں اور جدا جدا عقیدہ و مذہب کے ماننے والوں میں ہم آہنگی اور یک جہتی کی ضرورت کا احساس ہے مگر اس کو فروغ دینے اور بروئے کار لانے سے برابر غفلت و بے پروائی اختیار کی گئی، اس لئے جارحانہ فرقہ پرستی کو خوب پھولنے پھلنے کا موقع ملا اور فرقہ پسند عناصر اتفاق و اتحاد کو بیخ و بن سے اکھاڑنے اور نفرت و عداوت کی آگ بھڑکانے میں پوری طرح کامیاب رہے لیکن یہ خوشی کی بات ہے کہ اسوقت مرکز اور صوبہ کی حکومتیں قومی یک جہتی کو فروغ دینے کے لئے متحرک دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی قومی یک جہتی کمیٹیوں کے جلسے ہو رہے ہیں، گزشتہ مہینہ راقم کو اترپردیش کے وزیر اعلا کی صدارت میں ہونے والے قومی یکجہتی کونسل کے ایک جلسہ میں شرکت کا موقع ملا، جس میں مختلف لوگوں نے طرح طرح کی باتیں کہیں کچھ مفید اور سنجیدہ باتیں بھی سامنے آئیں اور غور و فکر کا موضوع بنیں، مجموعی اعتبار سے قومی یک جہتی کی ضرورت و اہمیت کو تسلیم کیا گیا، خود وزیر اعلا نے جن جذبات و احساسات کا اظہار کیا ان میں اعتدال و توازن تھا اور ان سے ان کی دردمندی اور ملک میں ایکتا اور فرقہ وارانہ میل جول کے لئے فکرمندی کا اندازہ ہوا مگر حقیقت یہ ہے کہ اسوقت کانگریس میں فرقہ پرست خود غرض اور اقتدار کے بھوکے لوگوں کی بڑی تعداد شامل ہوگئی ہے مگر وزیر اعلا سیکولرازم اور جمہوریت پر اعتماد رکھتے ہیں اور وہ اپنی شرافت و معقولیت کے لئے نیک نام ہیں۔

اگر حکومت قومی یک جہتی کے معاملہ میں واقعی مخلص اور سنجیدہ ہے اور اس کی ان کوششوں کا تعلق انتخابات سے نہیں ہے تو اسے اسکے لئے پیہم جدوجہد اور مسلسل اقدامات کرنے ہوں گے، یہ مسئلہ تقریروں اور جلسوں سے حل نہیں ہو سکتا، اس کے لئے وسیع اور طویل المیعاد منصوبے تیار کرنے ہوں گے اور ان اسباب و محرکات کا پتہ لگا کر ان کا سدباب کرنا ہوگا جن سے ملک میں اتحاد و یک جہتی کے بجائے اختلاف و تفریق کے رجحانات بڑھ رہے ہیں، جو لوگ ملک میں فرقہ واریت کا زہر پھیلا رہے ہیں اور نفرت و عداوت کا بیج بو رہے ہیں، ان کے معاملہ میں کوئی رو رعایت نہیں ہونی چاہئے۔ حکومت کو تمام شہریوں کے ساتھ غیر امتیازی رویہ اختیار کرنا ہوگا اور ہر گروہ کو بڑھنے اور ترقی کرنے کا یکساں موقع دینا ہوگا۔ سب کو مذہبی، فکری اور تہذیبی آزادی دینی ہوگی۔ اس پر بھی کڑی نگاہ رکھنی ہوگی کہ اس کا عملہ تعصب کا رویہ نہ اختیار کرے اور کوئی گروہ کسی پر اپنا عقیدہ و مذہب جبراً نہ مسلط کرے، نصاب تعلیم میں بنیادی تبدیلی لانی ہوگی اور تاریخ نگاری کے اس طریقہ کو چھوڑنا ہوگا جس نے ہماری گزشتہ تاریخ کو مذہبی آویزش اور قومی کشمکش کی آماجگاہ بنا دیا ہے۔

یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ قومی یک جہتی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مختلف مذہب و عقیدہ کو ماننے والے کسی ایک عقیدہ و مذہب کو قبول کرلیں اور اپنی وحدت و انفرادیت سے دستبردار ہو جائیں، بدقسمتی سے ملک میں ایک طبقہ اسی انداز کی باتیں کرتا ہے حالانکہ اس طرح کے اختلافات ہر حال میں باقی رہیں گے۔ مختلف مذاہب تو درکنار کیا ایک ہی مذہب کے مختلف گروہوں کے اختلافات ختم کئے جا سکتے ہیں، مسلمانوں میں شیعہ و سنّی اور ہندوؤں میں سناتن دھرم، بدھ اور جینی مذہب نیز برہمو سماج اور آریہ سماج کے اختلاف کو ختم کر کے کیا ملک میں یک جہتی پیدا کی جا سکتی ہے، جن ملکوں میں اس طرح کی کوششیں کی گئی ہیں ان میں اختلاف و تفریق اور بڑھ گئی ہے اسی لئے قومی ایک جہتی کا نام سن کر کمزور اور پس ماندہ طبقوں کو اپنا وجود خطرے میں نظر آنے لگتا ہے، حکومت کا فرض ہے کہ اس خطرے کو دور کرے اور کسی فرقہ کے مذہبی اور کلچرل دائرے میں نہ خود مداخلت کرے اور نہ دوسروں کو مداخلت کرنے دے۔

مقالات

کیا وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود نزاع لفظی ہے؟

از
جناب مولانا غلام محمد صاحب، کراچی۔

گیارہویں صدی ہجری سے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا مسئلہ اہل علم و عرفان کا مرکز توجہ بنا رہا ہے اور اس موضوع پر قابل قدر تصانیف معرض وجود میں آئی ہیں، ان تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر دور میں اس مسئلہ سے متعلق دو رائیں چلی آرہی ہیں، ایک یہ کہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود ناقابل تطبیق دو الگ الگ نظریات ہیں، دوسرے یہ کہ ان میں اختلاف حقیقی نوعیت کا نہیں بلکہ لفظی نزاع نے ان کو الگ الگ نظریات کی شکل دے دی ہے، اور ان میں تطبیق پیدا کی جا سکتی ہے، یہاں انہی نقطہائے نظر کا احتیاط سے جائزہ لیتے ہوئے صحیح صورت حال تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

نظریہ وحدۃ الوجود کی اصل، خواہ بقول شاہ رفیع الدین دہلوی[1] قرن اول میں بھی ملتی ہو مگر اس کو ایک مرتب نظریہ بنا کر علمی دلائل، کشفی یافت اور تائید و تاکید غیبی[2] کے ساتھ پیش کرنے کا

---

[1] دمغ الباطل مصنفہ شاہ رفیع الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ [2] شیخ اکبر قدس سرہٗ فرماتے ہیں۔

فانی رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مبشرۃ فی العشر الاخر من محرم

میں نے ایک رویائے بشارت میں جو مجھکو دکھلایا گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، محرم ۶۲۷ھ

(باقی ص ۸۶ پر)

سہرا الشیخ الاکبر محی الدین محمد بن علی بن محمد العربی الطائی الحاتمی (ف ۶۳۸ھ) قدس سرہٗ کے سر ہے جنہوں نے اپنی معرکۃ الآرا دقیق تصنیف فصوص الحکم میں پیش فرمایا اور اس کی تشریحات اپنی دوسری ضخیم تصنیف فتوحات مکیہ میں بھی تحریر فرمائی ہیں۔

حضرت شیخ اکبر کا نظریہ فی الجملہ تصوف کے تمام سلاسل، بشمول نقشبندیہ[1]، میں مسلم رہا ہے، بلاشبہ

سنۃ سبع وعشرین وستمائۃ بمحروسۃ	کے اخیر عشرے میں، محروسۂ دمشق میں، اور آپ
دمشق وبیدہ کتاب فقال لی ھذا	کے دستِ مبارک میں ایک کتاب تھی، آپ نے
کتاب فصوص الحکم خذہ واخرج بہ	فرمایا کہ یہ کتاب فصوص الحکم ہے، اس کو لے، اور
الی الناس ینتفعون بہ۔	لوگوں میں بیان کر تا کہ وہ اس سے مستفید ہوں۔

شیخ اکبر کے ان الفاظ کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو "افاداتِ شیخ محی الدین ابن عربی" مصنفہ حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی رح۔

[1] حضرت خواجہ عبید اللہ احرار قدس سرہٗ سلسلۂ نقشبندیہ کے عظیم ترین شیوخ میں شامل ہیں، ان کے "نصائح" میں وحدۃ الوجود کی پُرزور تائید ملتی ہے، ارشاد ہے:۔

"قرآن، حدیث، فقہ، ان تینوں کا خلاصہ اور نچوڑ تصوف ہے اور تصوف کا نچوڑ وحدۃ الوجود کا مسئلہ ہے، اور وحدۃ الوجود باتیں بنانے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ دل کے آئینہ کو نقوشِ کونیہ سے صاف کریں اور وتبتل الیہ تبتیلاً کا مصداق بن کر سب سے ٹوٹ پھوٹ کر خدائے تعالیٰ کی طرف ہی جھک پڑیں اور اسی کے ہو رہیں، جب جا کر کہیں دل سدھرتا، سنبھلتا اور ایسا جھکتا ہے کہ خود بخود وحدۃ الوجود کا مسئلہ اس پر عیاں ہو جاتا ہے۔" (گلزارِ اولیاء، مؤلفہ شیخ کبیر و محدث جلیل ابوالحسنات سید عبد اللہ شاہ حیدرآبادی نقشبندی مجددی و قادری رح)

شیخ علاء الدین سمنانی (ف ۷۳۶ھ) یا حضرت سید محمد گیسو دراز (ف ۸۲۵ھ) جیسے بعض مسلم شیوخ نے نظریۂ وحدۃ الوجود سے اختلاف فرمایا مگر ان بزرگوں کے اختلاف کی نوعیت شخصی رائے کی رہی، ان میں سے کسی نے بھی شیخ اکبر رح کے مقابل کوئی نظریۂ تصوف پیش نہیں فرمایا۔ البتہ گیارہویں صدی کے اوائل یعنی ۱۰۱۱ھ میں جب امام ربانی شیخ احمد فاروقی سرہندی قدس سرہٗ "خلعتِ مجددیت" سے سرفراز ہو کر اصلاحِ ملت کے منصب پر فائز ہوئے[1] اور حضرت ممدوح کو اپنے اطراف کے نام نہاد صوفیوں کا پیدا کردہ زندقہ کا وہ ماحول ملا جس میں شیخ اکبر قدس سرہٗ کے وجودی فلسفہ اور ان کی کئی اصطلاحات کی غلط تاویلات کے ذریعہ ویدانتی فلسفہ کی پورے زور و شور سے تلقین کی جا رہی تھی اور بڑی بے باکی سے کاشانۂ شریعت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تھی تو ایسے ناقابلِ برداشت ماحول میں شریعت محمدیہ کی تجدید، عقائدِ حقہ کی ترویج اور صحیح دینی روح بحال کرنے کیلئے حضرت مجدد قدس سرہٗ نے شیخ اکبر قدس سرہٗ کے نظریہ وحدۃ الوجود کی تردید فرماتے ہوئے نظریہ وحدۃ الشہود اور شیخ کے فلسفہ اعیانِ ثابتہ کے مقابلہ میں اپنا فلسفہ ظلال و عکوس اور شیخ کی اختیار فرمودہ اصطلاحات کے متبادل اصطلاحات پیش فرمائیں۔ یوں گیارہویں صدی ہجری سے دو مستقل نظریے منظرِ عام پر آئے اور پھر ان کے رد و قبول یا ان میں باہمی تطبیق و مصالحت کی مساعی کا آغاز ہوا، اور چوٹی کے علمائے ربانی نے اس میں حصہ لیا ہے۔

تمہید بالا سے ظاہر ہے کہ موضوعِ بحث نازک اور دقیق ہے اور اس پر گفتگو علم، ذوق، نظر اور انشراحِ صدر کی طالب ہے اس لئے مجھ ہیچ میرز کی لب کشائی بے باکی اور مجھ محجوب کا اظہارِ خیال سوئے ادب سمجھا جا سکتا ہے مگر میری آنکھوں کا سرمہ چونکہ ان ہی بزرگوں کی گردِ راہ ہے اس لئے میری معروضات اس پہلو سے اعتنا کی مستحق ہیں کہ ۔

[1] "حضرت مجدد الف ثانی" مؤلفہ شاہ زوار حسین رحمۃ اللہ علیہ بحوالہ روضۃ القیومیہ (ص ۱۵۸)

گاہ باشد کہ کودک ناداں　　از غلط برہدف زند تیرے

وجود و شہود کا تقابل صحیح نہیں

احقر نے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے نظریات میں علمی رائے سے جتنا غور کیا اور اپنے عالی نسبت، قوی التاثیر پیر و مرشد کے فیضان توجہ و تربیت سے نیز بعض اور مشائخ کے الطافِ کریمانہ سے ان حقائق کو عملاً جس درجہ میں سمجھ سکا، تو یہ حقیقت انشراحِ صدر کے ساتھ سامنے آئی کہ فی نفسہٖ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا تقابل نہ علمی پہلو سے صحیح ہے نہ درجۂ حال کے اعتبار سے درست ہے، علمی اعتبار سے تو یوں صحیح نہیں کہ وحدۃ الوجود ربطِ خالق و مخلوق کی تعبیر ہے درآں حالیکہ وحدۃ الشہود کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں، وہ تو توحیدی غلبۂ حال میں سالکِ طریق کی ایک دید ہے، ایک مرحلہ ہے، ایک کیفیت ہے، لہٰذا دو مختلف الاصل حقیقتوں کا تقابل کیسے صحیح ہو سکتا ہے حضرت شیخ اکبرؒ کے نظریۂ وحدۃ الوجود کا تقابل اگر کرنا ہی ہو تو وہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نظریۂ ظلال و عکوس سے ہو سکتا ہے جو ربطِ خالق و مخلوق کی دوسری تعبیر ہے، مگر عام طور پر نظریۂ ظلال کی واقفیت خود مجددی سلسلہ کے شیوخ میں ناپید ہے،

رہا یہ سوال کہ پھر عموماً وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا تقابل کیسے ہوتا چلا آ رہا ہے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وحدۃ الوجود نہ صرف ربطِ خالق و خلق کی تعبیر عرفانی ہے بلکہ یہ سالکِ طریق کا حال بن کر بھی مشاہد ہوتا ہے[1] اور اس میں شاہد و شہود کا امتیاز تک باقی نہیں رہتا جب کہ شہودی حال میں باقی رہتا ہے، اس وجودی حال اور شہودی حال میں تقابلی گفتگو ہو سکتی ہے چنانچہ مکتوبات امام ربانیؒ میں اس حیثیت کا تقابل اور موازنہ موجود ہے، مگر اس پہلو سے عجیب بات یہ مشاہدہ میں آتی ہے کہ بعد والوں

[1] حضرت شیخ وجیہ الدین گجراتی رحمۃ اللہ علیہ بڑی قوت سے فرماتے ہیں "کسے کہ منکر توحید و وحدۃ وجود باشد او را تصور نقش اللہ و شغل طاقیچہ باید فرمود، چوں عمل کند آید" (خود ہی جھک مار کر قبول کرے گا۔" (علمی نقوش مصنفہ مؤلفہ شیخ طریقت ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب مدظلہٗ)

نے گو اس کو اختلافی حیثیت دے کر ایک کی تردید اور دوسرے کا اثبات کیا ہو مگر خود حضرت مجددؒ کو یہاں شیخ اکبرؒ سے کوئی اختلاف نہیں بلکہ وہ وجودی حال کی تائید فرماتے ہوئے مزید مراتب ترقی کا ذکر فرماتے ہیں مکتوبات امام ربانی جلد دوم کا مکتوب نمبر (۴۲) جو دس صفحات پر پھیلا ہوا ہے اس میں حضرت مجددؒ کا صاف و صریح ارشاد ہے:۔

خلاف ایں فقیر با ایشاں دریں امور
از راہ کشف و شہود است، علمائے قبح
ایں امور قائل اند و ایں فقیر بہ حسن
ایں امور بشرط عبور!

اس فقیر کا ان حضرات (وجودیہ) سے
اختلاف کشف و شہود کی راہ سے ہے، علماء
ان امور کی قباحت کے قائل ہیں اور یہ
فقیر ان کے حسن (صحت) کا قائل ہے۔
بشرطیکہ اس سے عبور (ترقی) ہو جائے۔[1]

[1] اس "شرطِ عبور" کی حقیقت عارف باللہ حضرت پیر سید مہر علی شاہ نور اللہ مرقدہٗ نے یوں بیان فرمائی ہے: حضرت مجدد صاحبؒ کو شغل اوقات نے حضرت شیخ (ابن العربیؒ) کی کتابوں کے بالاستیعاب مطالعہ کی فرصت نہیں دی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بھی مکتوب مدنی میں ایسا ہی فرمایا ہے، ورنہ (حضرت مجددؒ) ایسا نہ فرماتے، ہمارے اور شاہ ولی اللہؒ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ توحیدِ وجودی دو قسم کی ہے، اول وہ جو اثنائے سلوک میں بہ سبب ذہول ماسوی اللہ کے پیش آتی ہے اور اس میں استغراق بعدم فرق مراتب اور اختلافِ احکام بحسب درجۂ امکان کا موجب ہوتا ہے۔ اس مقام توحید کو حضرت شیخ فتوحاتِ مکیہ میں سالک کے نقصان سے نشان دیتے ہیں۔ دوم توحیدِ کاملین ہے، کہ انتہائے منازل میں ذہول کے باعث نہیں بلکہ مشاہدات یقینیہ سے حاصل ہوتی ہے، شیخؒ توحید کی اس دوسری قسم والوں میں سے ہیں اور لیس فی الوجود الا ھو کے قائل۔ اور ورود احکامِ شرعیہ کا اعتراض اس طرح دفع کرتے ہیں کہ حقیقت واحدہ جس میں اثنینیت اور دوئی قطعاً ملحوظ نہیں وہ تو کمال ذاتی کے اعتبار سے ہر اس چیز سے منزہ ہے جو دل میں آئے، وہاں اجرائے احکام کی

چند جملوں بعد مزید پُرزور تصریح یوں فرمائی گئی ہے:-

اینجا باطل چیست و بطلان کجا، دریں موطن	یہاں باطل کیا ہے اور بطلان کی گنجائش
استیلائے حق است و بطلان باطل!	کہاں، اس منزل میں ذاتِ حق کا غلبہ ہے
	اور اس کا بطلان (تردید) خود باطل ہے،

حضرت مجدد قدس سرہٗ کی اس غیر مبہم تصریح و تنبیہ کے بعد مسئلہ وجود و شہود میں شورِ اختلاف کی کیا اہمیت باقی رہ جاتی ہے اور تطبیق و عدمِ تطبیق کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔

وجودی و ظلالی تعبیر دراصل شیخ اکبرؒ اور حضرت مجددؒ میں اختلاف، ربطِ خالق و خلق کی تعبیرات میں ملتا ہے اور ان ہی دو تعبیرات یا نظریات کے اختلاف کو دور کرکے تطبیق دینے کی کوشش حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور مولانا اسمٰعیل شہید دہلویؒ جیسے بزرگوں نے فرمائی ہے، اس کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ تعبیرِ وجودی اور تعبیرِ ظلالی کو اختصار کے ساتھ پیش کردیا جائے۔

گنجائش کہاں، وہاں تو احکام مرتبۂ تنزلات و تعینات پر وارد ہوتے ہیں اور تلوث عیوب کی نسبت جاعل اور مظہر تک نہیں پہنچتی بلکہ یہ امر بعض طبائع دُون بعض تک متصور ہے اور اجسام کثیفہ کے خواص سے ہے، ماتری فی خلق الرحمٰن من تفاوت۔ حقیقت میں تو نظر میں عین واحد اور احکام مختلف ہیں کیونکہ مظاہر کی ہستی دونوں عدموں کے درمیان مستعار ہے، نہ خود بخود ظہور کیا نہ اپنے آپ قائم ہے بلکہ ظہور و قیام میں مظہر و قیوم کی طرف محتاج ہے، گویا مظاہر کا ظہور اسمِ ظاہر کے ظہور سے ہے، ورنہ ممکنات زائلہ حادثہ کی کیا قدرت کہ بجز فیضِ ربوبیت ھو الظاھر کوئی مستقل نام و نشان رکھیں، پس بہ این معنی غیریت منتفی ہے، لیکن ان مقبولین کے نزدیک حفظِ مراتب توحید ضروری ہے۔

ع گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی

(ملفوظاتِ مہریہ۔ ملفوظ ۱۷۷، شائع کردہ خانقاہ گولڑہ شریف۔ راولپنڈی)

تعبیرِ وجودی

"خوب سمجھ لو کہ تخلیق، اشیا کا عدمِ محض سے[1] پیدا ہونا نہیں ہے کیونکہ عدم سے عدم ہی پیدا ہوتا ہے، نہ ہی عدمِ محض[2] کا اشیاء کی صورت میں نمایاں ہونا ہے کیونکہ عدمِ محض تعریف ہی کی رو سے کوئی شئے نہیں کہ کسی ہستی کا مادہ بن سکے یا اس کو کسی ہستی کی صورت میں ڈھالا جاسکے۔ (العدم لا یوجد) اور نہ ہی[3] حق تعالیٰ کا خود صورتوں میں تقسیم ہوجانا ہے، کیونکہ وہ تجزی اور تبعیض سے منزہ ہے، تعالی اللہ عن ذٰلک علواً کبیراً، تخلیق حق تعالیٰ کا مع بقائہٖ علی ماھو علیہ کان بصورِ معلومات، بمصداق ھو الظاھر، تجلی فرمانا ہے اور یہ تجلی (یا تمثل) ان صورِ علمیہ (ذاتِ اشیاء یا حقائقِ کونیہ) کے مطابق ہو رہی ہے، جو ذاتِ حق میں مخفی اور علم میں مندرج ہیں۔ اسی تجلی و تمثل کا نتیجہ ہے کہ اشیاء کا نمود یا احکام و آثار خود بالتفصیل انکی قابلیت ذاتی کے مطابق خارج میں، جو وجود ظاہر ہے، ہو رہا ہے۔ ہر صورتِ علمی جو ذاتِ شئے

تعبیرِ ظلالی

"صفاتِ ثمانیہ (حیات، علم، ارادہ، قدرت، سماعت، بصارت، کلام، تکوین[1]) خارج میں موجود ہیں، اس لئے ان کو ذات سے خارج میں متمیز ہونا چاہئے، ان صفات کی اثر آفرینیوں کی کیفیت یہ ہے کہ ہر ہر صفت کے مقابل ایک عدم ہے مثلاً علم کا مقابل جہل ہے اور قدرت کا مقابل عجز، اور یہ تمام "اعدام" علمِ حق میں متمیز اور واضح ہیں اور تمیز و وضاحت کی اسی نوعیت سے ان کو اسماء و صفات کے لئے بمنزلہ آئینوں کے کر دیا ہے یا یوں کہئے کہ انوارِ حق کے نقطۂ نظر سے انکی حیثیت مہبطِ انوار یا تجلی گاہ کی ہے۔ ان معنوں میں حقائقِ ممکنات کا مطلب یہ ہوا کہ یہ اسماء و صفات کے ان عکوس و ظلال سے تعبیر ہیں جو ان اعدام پر اثر انداز

---

۱ اشاعرہ حق تعالیٰ کی صفاتِ ذاتیہ ازلیہ سات مانتے ہیں یعنی تکوین کو شامل نہیں کرتے لیکن ماتریدیہ تکوین کو بھی شامل کرکے آٹھ صفاتِ ذاتیہ کے قائل ہیں اور حضرت مجدد قدس سرہٗ بھی اسی کی تائید فرماتے ہیں۔

یا ذات خلق ہے اپنے اقتضائے ذاتی اور استعداد اصلی کے مطابق فیض یاب وجود اور بہرہ یاب صفاتِ وجودی ہو رہی ہے۔

خوب سمجھ لو کہ خلق کا وجود حق تعالیٰ کے ظہور یا تجلی و تمثل کے بغیر ناممکن ہے اور حق تعالیٰ کا ظہور یا تجلی و تمثل بغیر صور خلق (صور علمیہ) کے ممکن نہیں، یہ شیخ اکبرؒ کے الفاظ میں ایک دوسرے کے آئینے ہیں۔"[1]

ہوئے ہیں گویا اعدام کو مادہ ٹھہرانا چاہئے اور یہ عکوس وظلال جو ان پر اثر انداز ہوتے ہیں، صورت ہے جو مادہ میں حلول پذیر ہے۔"[2]

گویا تعبیر وجودی کی رو سے وجود واحد ہے اور وہ وجود حق ہے۔ البتہ ذات دو[2] ہیں ایک ذات حق اور دوسری ذات خلق۔ ذوات خلق کی حقیقت یا مادہ وہ صور علمیہ یا اعیان ثابتہ ہیں جو ذات حق میں مخفی اور علم حق میں مندرج ہیں۔ ان صور یا اعیان پر صفات کی تجلی پڑتی ہے تو اشیاء کا ظہور ہوتا ہے، شیخ اکبر قدس سرہٗ کے نزدیک عدم محض کوئی شے نہیں کہ ہستی کا مادہ بن سکے یا خود ہستی کی صورت میں ڈھل سکے، اس کے بالمقابل تعبیر ظلالی کی رو سے وجود دو[2] ہیں، ایک وجود حق دوسرا وجود خلق۔ اور وجود خلق کا مادہ صفات حق کے متقابل اعدام (عدمات) ہیں، ان اعدام پر ان صفاتی تجلیات کی جو اعیان ثابتہ پر پڑتی ہیں، عکوس وظلال اثر انداز ہوتے ہیں تو وجود خلق کا ظہور ہوتا ہے اس طرح حضرت مجدد قدس سرہ کے نزدیک خلق کا مادہ وہ عدمات ہیں جو صفاتی تجلیات کے عکس اور پرتو کو قبول کریں۔

---

[1] قرآن اور تصوف مؤلفہ ڈاکٹر میر ولی الدین ؒ مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی، ص ۷۹ [2] مکتوب مدنی از شاہ ولی اللہ دہلوی مترجمہ مولانا محمد حنیف ندوی، مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور۔ ص ۲۳

مذکورہ دونوں تعبیرات کی مفصل بحث سے جس کو دلچسپی ہو اسے "جواہر الحقائق"[1] مصنفہ حضرت سید شاہ عبداللطیف المعروف بہ سید شاہ محی الدین قادری ویلوری رحمۃ اللہ کا مطالعہ کرنا چاہئے، مجھے تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ مذکورہ تعبیرات میں جو واضح طور پر الگ الگ ہیں گیارہویں صدی ہجری کے بعد کے جن بعض بزرگوں نے تطبیق ظاہر فرمائی، ان میں حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت مولانا اسمٰعیل شہید اور حضرت شاہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہم اللہ بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

تطبیقات

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحؒ نے نظریہ وحدۃ الوجود اور نظریۂ عکوس وظلال میں اس طرح تطبیق ظاہر فرمائی ہے کہ:۔

فحقائق الممکنات عند الشیخ ابن العربی تلک الاسماء والصفات متمیزۃ فی العلم وعند الشیخ المجدد انما ھی عدمات انعکست فیھا انوار الاسماء والصفات وتلک العدمات وذالک الانعکاس انما کانت فی العلم ولکن الفاعل المختار جل مجدہٗ اذا شاء ان یوجد ماھیۃ من الماھیات فی الخارج جعلھا متصفۃ بالوجود الظلی فیصیر موجودا فی الخارج[2]

حقائق ممکنات کے بارے میں شیخ ابن عربی کے نزدیک یہ اسماء و صفات ہی کا دوسرا نام ہے جبکہ یہ مرتبۂ علم میں تعین و وضوح کی کیفیتوں کے حامل ہوں اور شیخ المجدد کی رو سے یہ عدمات ہیں جن پر اسماء و صفات منعکس ہوتے ہیں البتہ (یہ صحیح ہے کہ) ان عدمات اور عکوس کا محل اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ جو فاعل و مختار ہے یہ چاہتا ہے کہ ماہیت معلومہ میں سے کوئی ماہیت حیز علم سے نکل کر وجود میں آئے تو وہ اسے وجود ظلی بخش دیتا

---

[1] مطبوعہ المطبع مظہر العجائب مدراس ۱۲۷۴ھ۔ [2] جلد اول تفہیمات الٰہیہ۔ آخری مکتوب المتلقب بہ "مکتوب مدنی"

ہے اور (وہ ہیئت) خارج میں موجود
ہو جاتی ہے۔

اس طرح شاہ صاحب کے نزدیک دونوں تعبیرات میں معمولی سا فرق ہے اور آگے یہ توجیہہ فرماتے ہوئے کہ حقائق ممکنہ کا اطلاق کئی معنی پر ہوتا ہے، خلاصۂ بحث کے طور پر تحریر فرماتے ہیں:۔

وبالجملة فالقول بان حقائق الممكنات عكوس الاسماء المنطبعة فى الاعدام المقابلة لها ليس مخالفاً لكلام الشيخ ابن العربي واتباعه ۔ ۱؎	خلاصۂ کلام یہ ہے کہ یہ کہنا کہ حقائق ممکنات در اصل عکوس و ظلال ہیں جو اعدام متقابلہ میں مرتسم ہوتے ہیں، کسی طرح بھی شیخ ابن العربی اور ان کے متبعین کی تصریحات کے خلاف نہیں۔

اسی طرح مولانا اسمٰعیل شہید نور اللہ مرقدہٗ اپنی تصنیف عبقات میں اس عنوان کے تحت کہ "کیا اختلافِ وجود و شہود نزاعِ لفظی ہے؟" تائیداً یوں تحریر فرماتے ہیں:۔

"بہر حال عارف جامی اور شیخ صدر الدین قونوی کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ یہ لوگ شیخ محی الدین ابن عربی کے نظریۂ وحدۃ الوجود کے سب سے بڑے حامیوں میں ہیں لیکن وحدۃ الوجود کا جو واقعی مطلب ان حضرات نے خود بیان کیا ہے اس میں اور حضرت مجدد الف ثانی جو کچھ فرماتے ہیں اس میں انصاف سے بتاؤ کیا اختلاف ہے اور دونوں مسلکوں میں کیا فرق ہے؟!

بہر کیف فاطر و مفطور (خالق و مخلوق) میں قیومیت کے علاقہ کو مان لینے کے بعد دونوں دعوے درست ہو جاتے ہیں یعنی یہ بھی کہ (وجوداً) فاطر و مفطور میں اتحاد بھی ہے اور یہ بھی کہ موطن یا محل و مقام نیز ماہیت کے لحاظ سے دونوں میں جو مغائرت پائی جاتی ہے

۱؎ جلد دوم تفہیمات الٰہیہ۔ آخری مکتوب الملقب بہ "مکتوب مدنی"

اس کی وجہ سے ایک دوسرے کا غیر بھی ہے۔ واقعہ یہی ہے جس کے دو پہلو ہیں اور ہر ایک فریق ان دو پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کی طرف زیادہ جھک گیا ہے۔" ۱؎

رہے ہمارے تیسرے بزرگ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ انہوں نے جس تطبیق کی سعی فرمائی ہے وہ تعبیری ظلالی کے ساتھ نہیں ہے بلکہ شہود کشفی کے ساتھ ہے جو سالک طریق کو پیش آتی ہے، اور اس پہلو سے وجود و شہود کو نزاعِ لفظی ارشاد فرمایا ہے، چنانچہ حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور تصنیف "التکشف عن مہمات التصوف" میں جہاں "تحقیق مسئلہ وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود" کا عنوان قائم فرمایا ہے۔ اسی کے ذیل میں عارف رومیؒ کا یہ شعر بطورِ عنوان ثانی تحریر فرمایا ہے ؎

جملہ معشوق است و عاشق پردۂ — زندہ معشوق است و عاشق مردۂ

اور پھر اپنے شیخ حضرت اقدس حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی ترجمانی فرماتے ہوئے کشفی وجود اور کشفی شہود میں تطبیق کی صورت ظاہر فرمائی ہے اور اس جملہ پر یہ تشریح ختم فرمائی ہے کہ

"پس وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں اختلاف لفظی ہے کما قال مرشدی رحؒ"

لیکن اس کی بابت پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ جب خود امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کشفی وجود کے مخالف نہیں بلکہ موئید ہیں تو پھر تطبیق یا عدم تطبیق کی سرے سے ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے، اس کے بعد بات صرف تعبیر وجودی و ظلالی کی غور طلب رہتی ہے کہ ان میں تطبیق اطمینان بخش ہے یا نہیں۔

تطبیق سے اضطراب نہیں مٹتا

حقیقت یہ ہے کہ گو حضرات شاہ ولی اللہ و مولانا اسمٰعیل شہید نے تطبیق کی راہ اختیار فرمائی ہے مگر خود یہ حضرات جب حضرت شیخ مجددؒ کی تعبیر سے پوری طرح

۱؎ عبقات۔ ترجمہ اردو از حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رح مطبوعہ حیدر آباد دکن (ص-۹۱)

مطمئن نظر نہیں آتے تو ان کی تطبیقات کمزور پڑ جاتی ہیں۔ مثلاً حضرت شاہ صاحب اسی مکتوب مدنی میں اپنی اسی تحریر کے متصلاً بعد جو "تطبیقات" کے زیر عنوان اوپر نقل ہو چکی، ارقام فرماتے ہیں:۔

واختلف اقوالہ فی العالم فقال مرۃً ھو موجود فی الخارج وجوداً ظلیاً وقال اخریٰ ھو موجود فی الوھم الا ان اللہ تعالیٰ اتقنہ فی تلک المرابتۃ فصارا موھوماً متقناً۔	اس عالم (رنگ و بو) سے متعلق ان کی رائے مختلف ہے۔ کبھی تو وہ فرماتے ہیں کہ یہ عالم ظلی وجود سے بہرہ مند ہے اور کبھی یہ فرماتے ہیں یہ کائنات آراستۂ وہم ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے استواری بخشی ہے، اس لحاظ سے یہ عالم اگرچہ موہوم ہے مگر استوار و محکم بھی ہے۔

اسی طرح شاہ اسمٰعیل شہیدؒ وجودی و ظلالی تعبیرات میں تطبیق دکھانے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"باقی امام ربانی مجدد الف ثانی کے بعض اقوال سے بظاہر یہ جو معلوم ہوتا ہے کہ ممکنات و مخلوقات کی حقیقتوں کا تعین عدم اور نیستی سے وابستہ ہے یعنی ممکنات کی اصل ماہیت و حقیقت ان کے نزدیک 'عدم' ہے تو ظاہر ہے کہ اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو فاطر و مفطور کے اتحاد کی جو بنیاد ہے وہی منہدم ہو کر رہ جاتی ہے کیونکہ ایسی صورت میں مفطورات و مخلوقات کا وجود سے کوئی تعلق ہی نہیں رہتا اور اتحاد کا دعویٰ جو دونوں کے درمیان کیا جاتا ہے وہ تو اسی پر مبنی ہے کہ مخلوقات کے لئے بھی وجود مانا جائے، لیکن مجدد صاحب کی اس سے کیا مراد ہے؟ ہم جیسے لوگ جو کشف و شہود کی دولت سے محروم ہیں، ان کی سمجھ سے یہ خارج ہے، کوئی ایسی راہ ہمارے سامنے نہیں ہے جس کے ذریعہ سے ان کے اس دعوے کے صحیح مطلب کو ہم دریافت کر سکتے ہوں، واقعہ یہ ہے کہ عدم اور نیستی تو خیر دور کی

بات ہے، کسی معدوم شئی کے متعلق بھی ہم یہ سوچ نہیں سکتے کہ کسی موجود شئے کی قیومیت کا کام انجام دے یعنی کسی موجود چیز کی قیوم، شئے معدوم ہو!" [1]

خط کشیدہ جملہ سے مولانا شہید کا ظلالی تعبیر سے عدم اطمینان واضح ہے اور راقم الحروف کی عرض صرف یہی ہے کہ تطبیقی راہ سے اضطراب نہیں مٹتا۔

تطبیق کی بنیاد صرف "مصلحت" ہے

تصریحاتِ بالا کو دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان اکابر نے یہ راہِ تطبیق، جو تکلف سے خالی نہیں، کیوں اختیار فرمائی؟ اس کا جواب باصواب وہ ہے جو حضرت اقدس مرزا مظہر جان جاناں قدس سرہٗ کے قلم مبارک سے تحریر ہوا ہے، حضرت ممدوح کے خلیفہ مولینا غلام یحییٰ بہاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رسالہ اس موضوع پر تحریر فرمایا کہ وجودی و شہودی نظریات الگ الگ ہیں، ان میں تطبیق تکلف ہے، خلیفہ رشید کے اس رسالہ پر تقریظ حضرت شیخؒ نے تحریر فرمائی ہے جس میں صراحت فرمائی ہے کہ جن حضرات نے ان نظریات میں تطبیق دی ہے وہ محض بربنائے مصلحت ہے، فرماتے ہیں:۔

"تطبیق کے مسئلہ میں پڑنے کی ضرورت نہ تھی، دونوں مکاشفات میں یہ تطبیق تکلف سے خالی نہیں لیکن ایک مصلحت خیر کی بنا پر یہ توفیق و تطبیق اختیار کی گئی تاکہ دو بڑی جماعتوں میں مصالحت کی صورت پیدا ہو جائے۔ اللہ اس بندہ پر رحم فرمائے جو انصاف کرے اور مباحثہ سے اپنے آپ کو بچائے۔"

یعنی تطبیق محض اس مصلحت سے اختیار کی گئی کہ شیخ اکبرؒ اور شیخ مجددؒ کے متبعین آپس کے اختلافات سے بچیں اور دونوں اکابر شیوخ کی تعظیم و ادب ملحوظ رہے، ورنہ حقیقتاً دونوں نظریات میں تطبیق ایک تکلف ہے کیونکہ وہ الگ الگ حیثیت کے حامل ہیں۔

[1] ترجمہ عبقات محولہ سابق ص ۹۱ و ۹۲

شیخ اکبرؒ اور شیخ مجددؒ کے علوم کا فرق و امتیاز

اس ناچیز کی رائے میں اکابر عارفین دو گروہ میں منقسم ہیں اور ان کے فرق و امتیاز کو نہ سمجھنے سے غیر ضروری بحثیں چھڑ جاتی ہیں ۔۔ ایک گروہ تو سلطانِ شہبازانِ معرفت الٰہیہ کا ہے جو اسرار کے اظہار پر مامور ہوتے ہیں[1] انہیں اس سے سروکار نہیں ہوتا کہ ان کی باتیں نااہلوں اور سخن ناشناسوں تک پہنچ کر فتنہ کا سبب بنیں گی یا تصدیق و تکذیب کا بازار گرم ہوگا۔ اس کے بالمقابل دوسرا گروہ مجددِ دین کا ہے جو تطہیرِ عقائد، اصلاحِ اعمال، دفعِ بدعات اور احیائے سنت پر مامور ہوتے ہیں یہ حضرات اپنے منصب کی پابجائی میں نہ صرف ضلالت و گمراہی کی بلکہ ان کے اسباب کی بیخ کنی کی کوشش فرماتے ہیں جو وجہ ضلالت نظر آتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر ایسی عارفانہ اصطلاحات جن کی اہلِ ضلالت نے آڑ لے لی ہو نہ صرف ان کی تردید کرتے ہیں بلکہ فتنہ کی شدت پر نظر کر کے خود صاحبِ اصطلاح عارف پر تک صاف نکیر فرما دیتے ہیں۔ حالانکہ اس مجبورانہ عمل میں ان کا دل دھڑکتا ہے اور کبھی اس دھڑکن کی آواز دوسروں تک بھی پہنچ جاتی ہے اس لئے مطلق عارفین کے علوم کا تقابل حضرات مجددِ دین کے علوم سے نہ کیا جاسکتا ہے نہ کیا جانا چاہئے۔ رأس الصوفیہ شیخ اکبر قدس سرہٗ اور حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کی مثال اس کی آئینہ دار ہے کہ کہاں تو حضرت مجددؒ پوری قوت سے تردید فرماتے ہیں کہ ہم کو فص (فصوص الحکم) نہیں نص (قرآن) چاہئے، ہم کو فتوحاتِ مدینہ (احادیث نبویہ) نے فتوحاتِ مکیہ (تصنیف شیخ اکبر) سے مستغنی کر دیا ہے وغیرہ اور کہاں شیخؒ کی عظمت کی تاکید فرماتے ہیں، انکو مقبول بارگاہِ الٰہی تسلیم فرماتے ہیں، ان کے

[1] اور اذنِ مبارک سے سرمو آگے نہیں بڑھتے، جیسا کہ شیخ اکبر قدس سرہٗ فصوص الحکم کی "فص آدمیہ" میں فرماتے ہیں۔

"میں نے ان اسرار میں سے اس کتاب میں صرف اس قدر اسرار بیان کئے ہیں جن کی تعیین کی گئی، ان سب اسرار کو اس کتاب میں نہیں بیان کیا جو مجھ پر کھولے گئے کیونکہ وہ کسی ایک کتاب میں کہاں سما سکیں۔ ۔ ۔ میں نے جو کچھ مشاہدہ کیا اور دیکھا وہی اس کتاب میں لکھوں گا اور وہ بھی اسی قدر جتنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین و مقرر فرمایا۔"

"منکر الوغلط" میں مبتلا فرماتے ہیں بلکہ شیخ ممدوح کا یہ "احسان" مانتے ہیں کہ انہوں نے :-

"کمالِ معرفت سے اس دقیق مسئلہ 'وحدۃ الوجود' کی تشریح فرمائی اور ابواب و فصول میں ترتیب دے کر صرف و نحو کی طرح مدون فرمایا۔"[1]

اے کاش کہ حضرت شیخ مجددؒ کے مکتوبات شریف پر تاریخیں مندرج ہوتیں تاکہ حضرت کے اقوال میں ناسخ و منسوخ قول کا تعین ہو سکتا۔

بہر حال حضرت مجدد الف ثانیؒ تو خیر حضرت شیخ اکبرؒ کے معاملہ میں اتنے شدید نہیں جتنا کہ شیخ الاسلام علامہ احمد تقی الدین ابن تیمیہؒ (ف ۷۲۸ھ)، جو حضرت ابن عربیؒ کی بعد والی صدی کے مجددِ دین میں شمار کئے جاتے ہیں[2] علامہ ممدوح کی شیخ اکبرؒ پر دلخراش تنقید سے کون ذی علم واقف نہیں، مگر ایسے سخت ناقد کے قلب کی گہرائی میں بھی شیخ کی تصدیق ثبت نظر آتی ہے اور وہ اعتراف پر مجبور ہو ہی جاتے ہیں۔ علامہ ممدوح رحمۃ اللہ علیہ نے نصر بن سلیمان المنبجی (ف ۷۱۹ھ) کے نام جو مکتوب اپنی رحلت سے تقریباً نو برس قبل تحریر فرمایا ہے اس کا اقتباس ملاحظہ ہو :-

"حادث و محدث کا وجود عین خالق کا وجود ہے نہ تو وہ خالق کا غیر ہیں نہ ہی اس کے سوا کچھ اور ہیں اس اصل کو سب سے پہلے ابن عربی ہی نے پیش کیا، وہ اس معاملہ میں بالکل منفرد ہیں، ان سے پہلے کسی شخص یا عالم نے یہ نظریہ پیش نہیں کیا، آج کل کے تمام اتحادی اس نظریہ کی پیروی کر رہے ہیں لیکن ان سب میں ابن عربی اسلام سے قریب تر ہیں اور اکثر جگہوں پر ان کا کلام بہتر ہوتا ہے کیونکہ وہ ظاہر اور مظاہر کے درمیان فرق کرتے ہیں اور اوامر و نواہی اور امور شریعت کو اپنی جگہ پر برقرار رکھتے ہیں اور مشائخ نے جن اخلاق و عبادات کی تعلیم دی ہے ان پر عمل کرنے کا حکم دیتے ہیں۔"[3]

[1] مکتوبات امام ربانی جلد ۳، مکتوب ۸۹ [2] حافظ سیوطیؒ نے ابن تیمیہؒ کے معاصر ابن دقیق العیدؒ رحمۃ اللہ علیہ کو ساتویں صدی کا مجدد مانا ہے۔ [3] "امام ابن تیمیہ" مصنفہ مولانا محمد یوسف کوکن عمری، ص ص ۳۲۴ تا ۳۲۵

مندرجہ بالا نظائر سے حضرت شیخ اکبر کے علوم پر حضرت مجدد دین کی نکیر و تنقید کی حقیقت امت کے عوام کی اصلاحی مصلحت کے سوا اور کیا ٹھیرتی ہے اور ان تنقیدات سے معارف شیخ کی حقانیت پر کیا آنچ آتی ہے۔ اسی لئے مجھ عاجز کے نزدیک ائمۂ عارفین کے علوم سے حضرات مجددین کے علوم کا تقابل نہ صحیح ہے نہ ضروری، تقابلی مطالعہ چونکہ عہد رواں کا ایک فیشن بن گیا ہے، اس لئے اگر کرنا ہی ہو تو ایک امام عارف کے علوم کا دوسرے امام عارف کے علوم سے اور ایک اور مجدد کے علوم کا دوسرے مجدد کے علوم سے تقابل ہونا چاہئے تاکہ غیر واقعی بحثوں کا خاتمہ ہو، اور یہ ذوق عام ہو جائے کہ ہر شخص اپنی مناسبت اور حد استعداد کے مطابق کسی بھی بزرگ سے استفادہ کرے اور دوسرے پر طنز و تعریض سے اپنی زبان اور قلم کو بچائے رکھے۔

ع آرزو می خواہ لیک اندازہ خواہ

حاصل گفتگو یہ ہے کہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود الگ الگ نظریات ہیں، ان میں تطبیق کی کوشش گو "مصلحت خیر" ہی کی بنا پر ہو تکلف سے خالی نہیں، دوسرے یہ کہ ان نظریات کے فرق و امتیاز کا قائل ہوتے ہوئے دونوں بانیانِ نظریات کا ادب لازم رکھا جانا چاہئے جو کچھ مشکل نہیں، کیونکہ جب امام بخاریؒ کی امام ابو حنیفہؒ پر سخت تنقید کے باوجود ہم دونوں ائمہ دین کی عظمت و ادب کو بخوبی ملحوظ رکھے ہوئے ہیں تو ان خاصانِ معرفت الٰہیہ کا باہمی اختلاف ان کے یکساں ادب سے کیوں مانع ہو؟ دع نفسك و تعال (نفسانیت چھوڑ اور چلے آ۔)

فارسی ادب کا ارتقا

عہد بہ عہد

از: ڈاکٹر محمد استعلامی کناڈا

ترجمہ: جناب رئیس احمد نعمانی علی گڑھ

آج کل اہل ایران جو زبان بولتے ہیں وہ تین ہزار سال پرانی ہے، اس طویل مدت میں یہ زبان بہت سے انقلابات سے گزری اور اب ہمارے زمانے کے لوگوں کے لئے اس کی تاریخ کے ابتدائی نشانات معدوم ہو چکے ہیں۔ مثلاً سلسلۂ ماد کے بادشاہوں اور ان کے عہد کے لوگوں کے متعلق ہمارے پاس کوئی تحریر موجود نہیں ہے، محققین کا بیان ہے کہ: عہد ماد کی زبان آج کی کردی زبان کی بنیاد ہے۔ اور اگر چمڑے یا پتھر پر اس کی کوئی تحریر ہمارے پاس موجود نہیں ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ ان کی سلطنت زیادہ دنوں تک رہی اور نہ ان کے حدود سلطنت ہخامنشی عہد کے ایران کی طرح وسیع تھیں کہ دنیا کی تسخیر کا غرور ان کو چٹانوں کے سینوں اور مکانوں کی پیشانیوں پر اپنے کارنامے ثبت کرنے پر آمادہ کرتا، اور اگر انہوں نے کوئی ایسا کام کیا بھی ہوگا تو ہخامنشیوں کے پرجلال عہد میں لازماً ان کے آثار ناپید اور آنکھوں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔

قدیم ایران میں فارسی زبان تمام مقامات پر یکساں نہیں رہی ہے۔ جس طرح آج بھی گیلان، مازندران اور کردستان میں، نیز خراسان، کرمان اور فارس کے بعض حصوں میں فارسی زبان کا ایک مخصوص لہجہ ہے یا اصفہان، یزد، کاشان اور شیراز جیسے شہروں میں جملوں کے آخر میں ایک خاص قسم کی آوازیں سنی جاتی ہیں اور یہ سب اصیل، لطیف اور دلنشیں فارسی ہیں۔

قدیم ترین ایران میں بھی فارسی زبان کے لہجے اور بولیاں مختلف اور اسوقت کی سرکاری زبان کے مطابق تھیں،

ہخامنشی عہد کی زبان

جو محققین آج قدیم ایران کے زبان و ادب کے بارے میں تحقیق کر رہے ہیں انہوں نے ہخامنشیوں کی زبان کا نام "فارسی باستان" رکھا ہے جس کی کوئی تحریر کاغذ یا کاپی پر لکھی ہوئی ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ بلکہ سونے اور چاندی کی تختیوں پر لکھی ہوئی کچھ یادگار تحریریں ہمارے پاس موجود ہیں جو ایسے خط میں ہیں جس کا ہر حرف چند کیلوں کی تصویروں سے مرکب ہے اور اسی وجہ سے اس کا نام "خطِ میخی" رکھا گیا ہے۔

سب سے بڑی اور طویل تحریر جو ہخامنشیوں کی زبان میں باقی رہ گئی ہے وہ پتھر کا ایک کتبہ ہے جو داریوش کبیر کے حکم سے کرمان شاہ کے پہاڑ کی ایک مضبوط چٹان پر تراشا گیا ہے اور اس کا زیادہ تر مضمون اس بادشاہ کی فتوحات سے متعلق ہے۔ اگر ماہرینِ زبان نے خطِ میخی کی تحریروں کو پڑھنے میں غلطی نہیں کی ہے، تو کہنا چاہیئے کہ ہخامنشیوں کی زبان میں ثقیل الفاظ کے علاوہ طرح طرح کے لاحقوں اور مغلق اور پیچیدہ اصول قواعد موجود تھے۔

ہخامنشی عہد کی دو اور زبانیں بھی ہمارے یہاں معروف ہیں۔ ان میں سے ایک زرتشت کی "اوستا" کے قدیم حصوں کی زبان ہے اور دوسری ہندوستان کے لوگوں کی قدیم زبان ہے جو اب بھی جنوبی ہندوستان کے بعض علاقوں میں رائج ہے اور اس کا ایک اخبار بھی نکلتا ہے۔ اس زبان کو سنسکرت کہتے ہیں۔

اوستائی، سنسکرت اور فارسی باستان تینوں زبانوں کے الفاظ اور قواعد ایک دوسرے سے بہت مماثلت رکھتے ہیں اور یہ ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے باہمی تعلق کی سب سے نمایاں دلیل ہے۔

نامناسب نہ ہوگا، اگر یہاں اس امر کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے کہ آج کے محققین ہندوستانی اور ایرانی تمدن کی "اصل" ایک مانتے ہیں، آثارِ قدیمہ اور گزشتہ تاریخ کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ کسی زمانے میں یہ دونوں قومیں ایک ہی مقام پر زندگی گزارتی رہی ہیں جو آبادی کے اضافہ کی وجہ سے دوسرے مقامات کی طرف منتقل ہو گئیں۔ اور چونکہ ان کی دونوں نسلوں نے مختلف آب و ہوا،

اور دو طرح کے مذہبی اور تمدنی ماحول میں پرورش پائی اس لئے آہستہ آہستہ ان کے الفاظ اور آوازوں میں اس قدر تغیر ہو گیا کہ ہم انہیں دو مختلف چہرے سمجھنے لگے ہیں۔

فارسی باستان اور اوستائی کے معاصر زبانیں ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایک ہی وقت میں ایرانیوں کی دو سرکاری زبانیں تھیں۔ کیونکہ یہ دو زبانیں قدیم ایران کے دو بڑے بڑے حصوں میں رائج تھیں، تحقیق و قیاس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ جنوبی اور غربی ایران کے لوگ فارسی باستان استعمال کرتے تھے اور ایران کے شمال شرقی اور مشرق کے علاقے میں اوستائی رائج تھی۔ بظاہر شمال شرقی حصے کی زبان اس مقدس سرزمین کی زبان ہے جس کو زرتشت "ایران ویج" کے نام سے یاد کرتا ہے۔

اوستائی زبان کے اسلوب

زرتشت کی کتاب کے باقی ماندہ اجزاء سے ظاہر ہوتا ہے کہ اوستائی زبان کے قدیم و جدید دو اسلوب رہے ہیں۔ اوستا کے موجودہ حصوں میں ایک حصہ کا نام گاتھا یا گاتا (بمعنی وقت، ارادہ، نغمہ) ہے۔ اس کو زبان کے ماہرین اوستا کے دوسرے حصوں سے زیادہ پرانا سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زرتشت کی اپنی زبان یہی زبان تھی جس میں اس نے اوستا کے گاتھا نظم کئے ہیں۔ اوستا کے دوسرے حصے ماہرین کی رائے کے مطابق زیادہ آسان اور زیادہ نئے ہیں وہ ایران ویج کے پیامبر کی موت کے بعد تیار کئے گئے ہیں اور بعد کے لوگوں کی زبان میں دوبارہ لکھے گئے ہیں۔

زرتشت نے گشتاسپ نام کے ایک بادشاہ کے زمانے میں اپنا مذہب ایجاد کیا تھا اور اسی بادشاہ کی مدد سے (جس کا زمانہ صحیح طور پر معلوم نہیں) اس نے اس مذہب کو رواج دیا تھا۔ اس بادشاہ کا دربار بلخ میں تھا گویا اس کا خاندان قدیم کیانی سلسلے کے ان باقی ماندہ لوگوں میں سے تھا، جو ہخامنشی سلطنت کے وجود میں آنے سے چند صدیوں پہلے خراسان اور ماوراءالنہر میں حکمراں رہے ہیں۔ محققین کی ایک جماعت گشتاسپ اور زرتشت کے عہد کو چھٹی صدی قبل مسیح بتاتی ہے مگر ایک دوسری جماعت کے نزدیک یہ دو ہزار سال قبل مسیح ہے۔

موجودہ اوستا کے پانچ اجزا کے علاوہ اوستائی زبان کی کوئی تحریر ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ یہ اوستائی تحریریں ایسے خط میں لکھی گئی ہیں جو دنیا کے کامل ترین خطوط میں سے ہے۔

چوتھی صدی ہجری کے معروف مؤرخ مسعودی نے لکھا ہے کہ اوستا کو گائے کے بارہ ہزار چمڑوں پر زرتشت کے ایجاد کردہ خط میں لکھا گیا تھا مگر یہ چمڑے ایران پر سکندر کے حملے کے وقت ضائع ہو گئے۔ یہ خط ساسانیوں کے عہد میں بھی رائج رہا ہے اور اس وقت اس کا نام "دین دبیری (تحریر مذہبی)" تھا۔ اور ساسانی عہد کے دوسرے خطوط اسی اوستائی خط سے ماخوذ یا اس کی نقل ہیں، حتیٰ کہ اسلام کے بعد فارسی کے بہت سے حروف ہجا جن کو عربی خط کہا جاتا ہے وہ بعینہٖ یا معکوس شکل میں اوستائی حروف میں سے ہیں۔[3]

غرض ہخامنشی عہد کے ایران کی زبان میں ہمارے پاس کوئی ادبی ذخیرہ موجود نہیں ہے۔ اور جو کچھ ہے وہ تاریخی یادداشتیں یا بادشاہوں کی مہریں اور ان کی یادگاریں ہیں۔ رہی زرتشت کی کتاب تو اس میں تاثیر اور جذبہ ہے اور گاتھا کے بعض اشعار کی معنویت اور تازگی اب بھی برقرار ہے۔ مذہبی تحریر ہونے کے باوجود اوستا شاعرانہ لطف و لذت سے خالی نہیں ہے۔

اسکندر اور اس کے بعد کا دور

حضرت مسیحؑ کی پیدائش سے ۳۳۶ سال پہلے جزیرہ نمائے بالکان کے مشرق میں ایک شخص نے حکومت حاصل کی اور وہ درۂ دانیال کے تنگ راستے سے چالیس ہزار فوجیوں کے ساتھ ایشیائے صغیر (ترکی) کی طرف روانہ ہوا۔ یہ الکساندر (اسکندر) مقدونی تھا جس نے بہت تھوڑی مدت میں ہخامنشی سلطنت کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا اور شاہنشاہِ ایران داریوش سوم نے اپنے سرداروں کی بے وفائی کے نتیجے میں شکست کھائی اور مارا گیا۔ اس طرح ہخامنش کی اولاد کی حکمرانی ختم ہو گئی اور تیرہ سال تک اسکندر خود کو ایران کا شاہنشاہ سمجھتا رہا۔ بالآخر وہ بھی سخت بخار میں مبتلا ہو کر بابل کے بادشاہوں کی یادگار ایک

محل کے اندر مر گیا۔ اس کے سرداروں نے سلوکی سلطنت کی بنیاد ڈالی اور چند سال تک اس سرزمین پر سلوکیوں کا نام و نشان رہا۔ ان برسوں میں ایرانی زبان و تمدن کا تسلسل ٹوٹ چکا تھا اور تمام چیزوں پر یونانیت چھائی جا رہی تھی، سلوکیوں کا اقتدار حضرت مسیحؑ کے پیدا ہونے سے پچاس سال پہلے تک قائم رہا۔ اسکندر کے مرنے کے ستّر سال بعد، خراسان کے اصیل لوگوں کے ایک خاندان نے ایک نئی حکومت کی بنیاد رکھی جو تقریباً پانچ سو سال تک برقرار رہی، ان کو ہم "اشکانیوں" کے نام سے جانتے ہیں۔ اس خاندان کے عہد میں ایرانی زبان میں پھر سے جان پڑ گئی اور کتابیں اور پتھر کے کتبے وجود میں آئے۔

اشکانی عہد

اشکانیوں کی زبان (پارتی یا پہلوی اشکانی) میں بے شبہ قیمتی ادبی آثار موجود رہے ہیں۔ مشہور داستان "سندباد نامہ" کی اصل کو اہلِ تحقیق اسی عہد کی تالیفات میں سے سمجھتے ہیں۔

دوسری کتاب "درخت آسوریک" بھی پہلوی اشکانی زبان کی ایک منظوم داستان ہے۔ کچھ عرصے پہلے جب آثارِ قدیمہ کے ماہرین مشرقی ترکستان کے شہر ترفان میں کھدائی کر رہے تھے تو پہلوی اشکانی کی تحریروں کا ایک عمدہ مجموعہ ان کے ہاتھ لگا جس کا اکثر حصہ ساسانیوں کے معاصر مانی پیامبر کے مذہب کی تبلیغ کے موضوع پر ہے۔ ان تحریروں کا خط پہلوی ساسانی خط سے مشابہت رکھتا ہے، اس خط کو "آرامی خط"[4] سے ماخوذ بتایا گیا ہے مگر دراصل یہ زرتشتی خط سے ماخوذ اور "دین دبیری" یا "ویسپ دبیری" کے اسالیب میں سے ایک اسلوب ہے۔

اشکانیوں کی سلطنت ساسانیوں کی سلطنت کے مقابلے میں زیادہ وسیع اور طاقتور نہیں تھی۔ اور ان کی تہذیب و تمدن بھی ساسانی شان و شوکت کے مقابلے کی تاب نہ لا کر فنا ہو گیا تھا۔ اسی لئے اس عہد کی ستر کتابوں میں سے چند کتابوں اور مختصر تحریروں سے زیادہ ہمارے ہاتھ کچھ نہیں لگا۔

ساسانی عہد | تیسری صدی عیسوی کے نصف اوّل میں ایران کی حکومت پھر ایرانیوں کے ہاتھ میں آگئی اور بابک کا بیٹا اردشیر جس کو تاریخی روایات اور رزمیہ داستانیں کیانی خاندان کے پسماندگان میں شمار کرتی ہیں وہ ساسانی سلطنت کی بنیاد ڈالتا ہے اس کی اولاد چار سو سال تک ایران پر حکمرانی کرکے اپنی فتوحات، عدل پسندی اور علم دوستی کا آوازہ بلند کرتی ہے۔

پہلوی زبان | ساسانیوں کا عہد ایرانی زبان و ادب کے تعلق سے معلوم و مشہور ہے۔ اس عہد کی مختلف کتابیں شعری مجموعے، سوانح، تاریخ، جغرافیہ سے متعلق تصنیفات، نصیحت نامے، اوستا کی شرحیں اور دوسرے لٹریچر اس وقت موجود ہیں جن کو عہدِ اسلامی کی فارسی زبان سے قربت و مشابہت کی وجہ سے پڑھا اور سمجھا جاتا ہے۔ جس زبان اور خط میں یہ کتابیں ہم تک پہنچی ہیں اس کا نام "پہلوی" ہے۔

ساسانیوں کا خط و اسلوب زرتشتی سے مختلف تھا۔ مذہبی کتابیں "دین دبیری" اسلوب میں لکھی جاتی تھیں، خط و کتابت کے لئے "ہام دبیری" (عام تحریر) کو استعمال کرتے تھے۔ سرکاری دفتروں اور مالی محکموں میں "آمار دبیری" (خط حسابداری) استعمال ہوتا تھا۔ غرض اسی طرح کے ۲۸ مختلف اسلوب تھے جن میں سے سات کا ذکر آغازِ اسلام کے وقت کی معتبر تاریخوں میں موجود ہے۔ ایک اسلوب کا نام "دیسپ دبیری" (خط کامل و جامع) تھا۔ اس خط میں الف با کی ۳۶۵ علامتیں مقرر تھیں اور تمام فطری آوازیں یہاں تک کہ بارش کے گرنے کی آواز بھی اس خط میں لکھی جاتی تھی۔

ان خطوط میں "ہام دبیری" یا "آدم دبیری" پہلوی خط کے نام سے مشہور ہوا، جو ساسانیوں کا سب سے سادہ اسلوب تحریر تھا اور اس کا سیکھنا بھی آسان تھا۔ آج کے لوگوں کے لئے اس میں دشواری یہ ہے کہ مختلف صامتوں کے بجائے ایک ہی علامت اس میں استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً اس خط میں د، ج، ی اور گ کے صامتوں کو ایک ہی شکل میں لکھا جاتا ہے اس کی وجہ سے پہلوی متن کو پڑھنا مشکل ہوتا ہے لیکن عہد ساسانی کے لوگوں کو جو اپنی زبان کے الفاظ سے ذہنی مناسبت رکھتے تھے یہ دشواری پیش

نہیں آتی ہوگی۔

اس زبان اور خط میں جو پہلوی ادب محفوظ رہ گیا ہے اس کے علاوہ بہت سے تراجم بھی موجود ہیں۔ ادھر چند صدیوں سے یورپ کے علماء کو بھی مشرقی تہذیب و ثقافت سے دلچسپی پیدا ہوگئی ہے اس لئے ان میں سے اکثر تحریریں فارسی میں منتقل ہوگئی ہیں علاوہ ازیں آیران کے اساتذہ اور محققین بھی ایک خاص جذباتی لگاؤ کی وجہ سے اس کام میں مشغول ہوگئے ہیں۔ اس سلسلے میں مشہور مصنف صادق ہدایت کا نام قابلِ ذکر ہے انہوں نے پہلوی ساسانی کی تین کتابوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

قدیم ادب و اسلوب کے ماہرین کا خیال ہے کہ قدیم ایران میں دو قسم کی نثر رائج تھی۔ تاریخی و دفتری تحریریں اور پتھر کے کتبے جو سادہ اور واضح ہوتے تھے، لیکن مذہبی اور علمی تحریریں ایک خاص طرز میں لکھی جاتی رہی ہیں اور یہ وہی طرز ہے جو تمام مذہبی کتابوں مثلاً عہدِ عتیق (توریت) اور قرآن میں بھی ہم کو نظر آتا ہے اس اسلوب میں جملوں کا یکساں طور پر ختم ہونا، ایک لفظ یا ایک ترکیب یا ایک جملے کا بار بار آنا، اس میں خوش آہنگی اور ملاحت پیدا کرتا ہے، اس کے اندر معروف ضرب الامثال کی طرف صرف اشارات ہوتے ہیں اس لئے آج ایک اوستائی یا پہلوی تحریر کو پڑھتے وقت ہم ایک نام یا ایک اشارے کے قدیم استعمال کو تاریخ کی کتابوں یا موبدوں کی یادداشتوں میں تلاش کرنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔

اسلامی عہد | عربوں کے ایران پر قابض ہو جانے سے ساسانیوں کی زبان بالکل فنا نہیں ہوئی بلکہ چار سو سال سے زیادہ مدت تک یہ علمی اور عام بول چال کی زبان رہی۔ آج بھی ایران میں ساسانی پہلوی کی بہت سی اہم کتابیں موجود ہیں جو اسلامی عہد میں لکھی گئیں۔

دری زبان | ظہورِ اسلام کے بعد ایرانی زبان کی ایک شاخ فارسی دری کہلائی جو ادبی زبان تھی۔ "دری" کے معنی درباری بتائے گئے ہیں گویا یہ اشکانی اور ساسانی عہد میں ایران کے دربار کی زبان رہی

ہے۔ محققین کے نزدیک یہ بنیادی طور پر اشکانیوں اور ساسانیوں کے عہد کی ایرانی زبانوں سے مختلف نہیں ہے، اگر الفاظ، ضمیروں اور لاحقوں کے تھوڑے سے فرق کو نظر انداز کر دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت یہ سب زبانیں ایک ہی ہیں۔ لیکن علم السنہ کے بعض محققین کے خیال میں "زبان دری"، خراسان کی زبان اور اشکانی زبان کا ضمیمہ ہے اس لئے کہ ایران میں اسلامی ادبیات کے وجود میں آنے کی ابتدا، خراسان ہی میں ہوئی ہے، جہاں اشکانیوں کی حکومت رہی ہے۔ چنانچہ ایرانی زبان کی بولیوں اور لہجوں میں خراسانی لہجہ کی کارفرمائی ہے اور ساسانی بادشاہوں نے بھی اس لہجے کو سرکاری زبان کا درجہ دے کر اپنے درباروں میں داخل کر لیا تھا۔

پہلی صدی ہجری سے تیسری صدی ہجری تک موبدوں اور زرتشتی پیروں کے آثار ساسانی پہلوی خط اور زبان ہی میں ملتے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں فارسی دری لکھنے والے ادیب و شاعر معدودے چند تھے جن کے نام سے نہ ہم کو واقفیت ہے اور نہ کلام سے۔

جب یعقوب لیث نے ہرات کو فتح کیا اور سیستان کے شعراء نے عربی اشعار کہہ کر اس کی مدح کی تو یعقوب نے کہا کہ جو زبان میں سمجھتا ہی نہیں اس میں کیوں اشعار کہے جاتے ہیں۔ چنانچہ یعقوب کے درباری انشاپرداز محمد وصیف سیستانی نے جو صاحب علم و قلم تھا اس کی فارسی زبان میں قصیدہ لکھا۔ جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:۔

ای امیری کہ امیران جہان خاص و عام
بندہ و چاکر و مولای و سگ بند و غلام

یہ دری زبان میں شاعری کی ابتدا تھی جس کا سہرا محمد وصیف کے سر پر بندھتا ہے لیکن اس راہ میں اس کا رہنما یعقوب لیث تھا جس کے دور میں دری شاعری کا آغاز ہوا، اس کے دور میں اس کے بعد چند دوسرے اشخاص نے بھی دری میں شعر کہے لیکن یہ سب ابتدائی کوشش تھی یہاں تک کہ ارک بخارا میں اسمٰعیل سامانی نے اپنے سر پر تاج حکومت رکھا اور ایرانی نسل کی دوسری اسلامی سلطنت

کی بنیاد قائم ہوئی۔ اس خاندان کے عہد حکومت میں دری شاعری کے نوزائیدہ بچے نے جان پکڑی اور زیادہ تنومند ہوا۔ سامانی بادشاہ کتابیں پڑھتے تھے، اشعار کا مفہوم سمجھتے تھے اور کم و بیش خود بھی شعر کہتے تھے۔ اس خاندان کا تیسرا بادشاہ نصر بن احمد تھا جو نظامی عروضی کے بقول "واسطۃ العقل آل سامان" تھا۔ اس نے فارسی شاعری کو بڑی وسعت و ترقی دی، اسی کے دربار میں رودکی جیسے شاعر نے شہرت و ناموری حاصل کی جس کے عیش و فراغت کی زندگی کو دیکھ کر ایک شاعر رشک سے یوں فریاد کرنے لگا۔

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش
عطا گرفت بہ نظم کلیلہ در کشور ![5]

شاعری کی طرح اس دور میں نثر دری نے بھی ترقی کی راہیں طے کیں، اور گو دوسری اور تیسری صدی ہجری میں نثر دری میں بعض کتابیں لکھی جا چکی تھیں تاہم قدیم ترین دری نثر کا جو نمونہ موجود ہے وہ ۳۴۶ھ کا ہے جس کا نام "شاہنامہ ابو منصوری" ہے۔[6]

۳۴۰ھ کے قریب ابو منصور بن عبدالرزاق نام کا ایک نیک طبیعت اور محب وطن شخص شہر طوس (مشہد) میں حکومت کرتا تھا جو بخارا کی سلطنت کی جانب سے پورے خراسان کی سپہ سالاری پر مامور تھا اس نے اپنے وزیر ابو منصور معمری کو حکم دیا کہ زرتشتی پیروں اور خراسان کے بوڑھے کسانوں کو طوس میں جمع کرکے ان کی مدد سے قدیم ایران کے بادشاہوں کے حالات لکھے۔ یہ کتاب سادہ اور صاف نثر میں لکھی گئی اور تیس سال کے بعد فردوسی کے منظوم شاہنامے کی بنیاد بنی۔

شاہنامہ ابو منصوری کا اب صرف دیباچہ موجود ہے۔ اس کتاب کے لکھے جانے کے بعد سامانیوں کے دربار میں فارسی کی چند اور کتابیں بھی لکھی گئیں جن میں سب سے اہم دو ترجمے ہیں ایک محمد بن جریر طبری (مازندرانی) کی تاریخ کا ترجمہ اور دوسرا محمد بن جریر ہی کی تفسیر قرآن کا ترجمہ، یہ دونوں کتابیں عربی سے فارسی دری میں ترجمہ ہوئی تھیں جو نثر دری کی اوّلین کتابیں ہیں۔ ان کی نثر سادہ

صاف اور فنی آرائش سے خالی ہے۔ پانچویں صدی ہجری تک کی فارسی دری کی تمام کتابوں کا یہی انداز ہے۔ یہی صفائی اور سادگی اس دور کی شاعری میں بھی پائی جاتی ہے۔ فردوسی جیسے شاعر کے کلام میں بھی نامانوس الفاظ اور ترکیبوں کے باوجود وہ ابہام اور پیچیدگی نہیں ہے جو خاقانی اور نظامی کے کلام میں یا صفوی عہد کے شاعروں کی شاعری میں ہے۔ سامانیوں کے عہد میں زیادہ تر شعراء اس خاندان اور نسل کے بادشاہوں کی مدح گوئی میں مشغول رہے ہیں۔ اور انہوں نے اپنے اشعار، قصیدے کے قالب میں نظم کئے ہیں۔ مگر بعض نے چند داستانوں کو بھی نظم کیا ہے اور کچھ نے عاشقانہ اشعار (غزلیں) بھی کہے ہیں جو سب کے سب بہت سادہ اور مؤثر ہیں۔ جب ہم شہید بلخی کا یہ شعر پڑھتے ہیں:

شنیده ام که بهشت آن کسی تواند یافت   که آرزو برساند به آرزومندی

تو محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے اپنے عہد کا ایک ایرانی بات کر رہا ہے۔ یا جب ہم شاہنامہ فردوسی کے اس مقام پر پہنچتے ہیں جب گیو توران کی طرف سفر کرتا ہے تاکہ کاؤس کے نواسے خسرو کو اسکی جانشینی کے لئے ایران بلا لائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ فردوسی گیو اور خسرو کی ملاقات کا حال فطری اور شیریں زبان میں بیان کرتا ہے۔ خسرو گیو کو خوش آمدید کہتے ہوئے بالکل طبعی انداز میں اس سے پوچھتا ہے۔

چگونه سپردی براین مرز راه ؟   ز طوس و ز گودرز و کاؤس شاه

چه داری خبر جمله هستند شاد ؟   همی در دل از خسرو آرند یاد ؟

جهان جوی رستم گو پیلتن   چگونه است و دستان آن انجمن ؟

شاید فردوسی کو محمود غزنوی کا معاصر ہونے کی وجہ سے سامانی عہد کا شاعر نہ سمجھا جائے لیکن جس وقت اس نے شہر طوس کے اندر اپنی "شاعری" شروع کی تھی اس وقت ایران سامانیوں کے قبضے میں تھا اور محمود غزنوی سامانی فوج میں ایک افسر تھا۔

محمود غزنوی کا دور پانچویں صدی ہجری کے شروع میں سامانیوں کی شان و شوکت کا کوئی نشان

نہیں ملتا بلکہ ہر جگہ محمود غزنوی کا بول بالا نظر آتا ہے۔ شعراء اور مصنفین کو بھی اس کے دربار میں عزت و حشمت نصیب ہوئی۔ ابو نصر مشکان جیسا صاحب کمال نثر نگار اس کے مخصوص دفتر کا سربراہ تھا جس کے ماتحت ابو الفضل جیسا مورخ کام کرتا تھا۔ ابو ریحان بیرونی کو بھی بادشاہ کے نزدیک رسوخ حاصل تھا جو نجوم و فلکیات کا مشہور عالم تھا۔ ابن سینا کو سلاطین اپنے درباروں میں بلاتے ہیں، لیکن یہ سیاحت پیشہ طبیب اور فلسفی غزنین سے منہ پھیر کر زیاریوں کے دربار کا راستہ لیتا اور وہاں سے ہمدان اور اصفہان چلا جاتا ہے اور آل بویہ کی وزارت کو محمود غزنوی کی حکومت پر ترجیح دیتا ہے۔

عنصری، فرخی، عسجدی اور دوسرے شعراء محمود کے دربار میں آمد و رفت رکھتے تھے اور مذکورہ بالا تینوں شاعر بادشاہ کے مخصوص ہم نشینوں میں سے تھے۔ عنصری کو بڑا عروج ملا اور اس کی دولتمندی کا چرچا اس کے بعد بھی ہوتا رہا۔ چھٹی صدی ہجری میں خاقانی کہتا ہے:

شنیدم که از نقره زد دیگدان   ز زر ساخت آلات خوان عنصری

ایک دوسرے شاعر کا نام غضائری تھا جو آل بویہ کے یہاں بود و باش اختیار کرنے کے باوجود محمود غزنوی کی مدح میں قصیدے لکھتا تھا اور غزنین سے اس کو اس کا صلہ بھی پہنچتا تھا۔

دری نثر و نظم کے علاوہ عہد غزنوی ایران کی اسلامی تہذیب کا خزانہ بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھا۔ ابن سینا کی متعدد طبی کتابیں فارسی میں تھیں، تاریخ نویسی کا نہایت بہتر نمونہ اسی عہد میں ابو الفضل بیہقی نے فارسی میں پیش کیا، ریاضی و نجوم میں ابو ریحان کی کتاب التفہیم اپنے عہد کی بے نظیر تصنیف خیال کی جاتی ہے، کشف المحجوب اور شیخ ابو القاسم قشیری کے ایک صوفیانہ رسالے کا ترجمہ تصوف کا بہترین سرمایہ ہے۔ اس دور میں شاعری کا دامن بھی خوب مالا مال نظر آتا ہے۔ عنصری اور دوسرے شعراء کا مدحیہ کلام اعلیٰ درجے کی شاعرانہ خوبیوں کا حامل ہے، ایران کا قومی رزمیہ شاہنامہ

اسی عہد میں مکمل ہوا اور دوسرے شعرا نے بھی اسی ساز پر نغمے چھیڑے ہیں، فرخی سیستانی کی عاشقانہ اور شیریں غزلیات اسی دور کے ادبی آثار میں سے ہیں۔

سامانی اور غزنوی دور کے اسلوب تحریر کی خاص خوبی سادگی، بے تکلفی، عربی الفاظ اور مشکل اصطلاحات کا کم ہونا ہے۔ اس کا نام "اسلوب خراسانی" رکھا گیا ہے۔ کیونکہ اس کی نشو و نما خراسان میں ہوئی۔

سلجوقی عہد چوتھی صدی ہجری میں خراسان کے شمالی حصے کے ترکوں کا ایک خاندان جو محمود غزنوی کی اجازت سے خراسان منتقل ہوا تھا، طاقتور ہوگیا ان کا سردار سلجوق اپنے زمانے کے معروف ترین لوگوں میں تھا۔ اس کے بیٹے طغرل اور داؤد غزنویوں سے منحرف ہو کر اس وسیع سلجوقی سلطنت کی بنیاد رکھتے ہیں جس کی حدود پانچویں چھٹی صدی ہجری میں ایک طرف ہندوستان سے اور دوسری طرف ایشیائے صغیر کی سرزمین سے ملتی ہیں، یہ حکومت جو پانچویں صدی ہجری کے نصف دوم میں غزنویوں پر غلبہ حاصل کرکے قائم ہوئی تھی۔ ساتویں صدی ہجری کے نصف آخر میں ایران سے اس کا چراغ گل ہو جاتا ہے۔

سلجوقی حکومت کے زمانے میں بھی علمی ترقی ہوئی، مدحیہ قصائد کا رواج اس عہد میں بھی قائم رہا۔ شاعروں کی ایک جماعت صوفیانہ مضامین کے بیان اور نظم کرنے کی طرف مائل ہوئی۔ اور اس وسیلے سے ایرانی ثقافت کے لئے ایک قیمتی سرمایہ مہیا ہوا۔

صوفیانہ آثار کا جو عظیم ذخیرہ غزنویوں کے عہد سے تیموریوں کے عہد تک پانچ سو سال کے عرصے میں وجود میں آیا اس کے اندر اعلیٰ درجے کے انسانی مضامین بیان ہوئے ہیں اور ایک بلند و برتر روحانی زندگی کو اختیار کرنے کی دعوت بھی دی گئی ہے۔ گو اس قسم کی شاعری کے بعض گوشے مثبت اور منطقی زندگی سے مطابقت نہیں رکھتے، پھر بھی ان میں پیش کئے گئے افکار لائق توجہ ہیں۔

سلجوقی عہد میں دو طرح کی شاعری نے زیادہ رواج پایا۔ ان میں سے ایک تو عشقیہ اور متغزلانہ

داستانیں ہیں جو مثنوی کی شکل میں مختلف اوزان پر نظم کی گئی ہیں اس سلسلے میں سرفہرست نظامی گنجوی کی پانچ مثنویاں ہیں جو خمسہ کے نام سے معروف ہیں ان میں کتاب "خسرو و شیریں" خاص طور پر اہم ہے جو عاشقانہ داستان ہونے کے علاوہ نظامی کی دوسری مثنویوں سے زیادہ لطیف اور فطری انداز میں نظم ہوئی ہے۔ اس عہد کی شاعری کی دوسری زیادہ رائج قسم غزل ہے، یعنی دس پندرہ اشعار کی عاشقانہ نظم جس کے اشعار ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ عہد سلجوقی کی غزل ساتویں صدی ہجری میں درجہ کمال کو پہنچی ہے اور اس فن میں سعدی شیرازی سب سے ممتاز ہیں۔

سلجوقی دور کی شاعری غزنوی اور سامانی کی شاعری سے زیادہ معنی خیز ہے تاہم فن شاعری اور لطافتِ کلام کے اعتبار سے، اس دور سے پہلے کے بہت سے شعری آثار بھی سلجوقی عہد کی شاعری کے ہم رتبہ ہیں۔ اس عہد کے اکثر شعرا ریاضی، طب، فلسفہ اور دوسرے علوم سے واقف اور اپنی شاعری میں دقیق معانی اور اصطلاحات کے استعمال پر قادر تھے جس کی وجہ سے ان کی شاعری مشکل ہوگئی ہے۔ خاقانی شروانی اس دور کا نمائندہ شاعر ہے۔

سلجوقیوں کے عہد میں شاعری کی طرح نثر بھی زیادہ مشکل اور معانی سے پُر ہوتی تھی۔ اس کی ابتدا غزنویوں ہی کے عہد میں ہوگئی تھی اور دربار غزنین ہی میں بہرام شاہ غزنوی کے منشی ابوالمعالی نصراللہ نے "کلیلہ و دمنہ" کا فارسی ترجمہ شیریں اور سنگین نثر میں کیا تھا اسی زمانے میں غور کے حاکموں کے دربار میں نظامی عروضی نے انشا پردازی، شاعری، طب اور نجوم کے موضوع پر "چہار مقالہ" کے نام سے ایک قیمتی کتاب تیار کی تھی۔ اس کی نثر بھی دشوار ہے، خاص طور پر مقالات کی ابتدا میں عربی کے مشکل الفاظ اور اصطلاحات بھری ہوئی ہیں۔

اس دور کے دوسرے ممتاز نثر نگاروں میں ناصر خسرو اور امام محمد غزالی کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں ایران کی ثقافت کے دو درخشاں چہرے ہیں جو نہایت ذی علم اور بلند افکار و خیالات کے حامل

تھے۔ اس ضمن میں خیام کا تذکرہ بھی ضروری ہے جس نے بے نظیر کتابیں لکھ کر فارسی شاعری اور نثر پر اپنی قدرت کا ثبوت دیا ہے۔

سلجوقیوں کے عہد میں متعدد تعلیمی ادارے بھی وجود میں آئے۔ الپ ارسلان سلجوقی کے وزیر خواجہ نظام الملک طوسی نے اس وقت کے بڑے بڑے شہروں (بغداد، نیشاپور، اصفہان وغیرہ) میں چند معیاری مدرسے قائم کئے جن میں نظری علوم، قرآنیات اور مذہبی تحقیقات کی تعلیم دی جاتی تھی اور ان مدرسوں کا تعلیمی نصاب و نظام بھی امتیازی طرز کا تھا غزالی جیسے لوگ ان تعلیم گاہوں میں معلم اور سعدی جیسے اشخاص ان میں طالب علم رہے۔ ان مدارس کا قیام ایران کی تاریخ کا ایک روشن نقطہ ہے جو خواجہ نظام الملک کے نام کی مناسبت سے "نظامیہ" کہلاتے تھے۔

چنگیز اور ہلاکو کا دور ۶۱۶ھ ایران کی تاریخ میں ایک منحوس سال تھا۔ اس سال محمد خوارزم شاہ اور اس کی ماں ترکان خاتون کا غیر عاقلانہ رویہ مغلوں کو ایران کی سرزمین پر کھینچ لاتا ہے جس کے بعد ایک عام تباہی رونما ہوتی ہے۔ ایران کے شہر ویران اور بڑے بڑے لوگ قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ ایک مؤرخ کا چشم دید بیان ہے کہ نیشاپور کے پر شکوہ علاقہ میں پانی تک بند کر دیا گیا البتہ فارس، کرمان، ترکی اور اصفہان وغیرہ میں اب بھی ایرانی ادب وفن کے کچھ اسکول کھلے رہ گئے تھے جو بحران مشکلات میں گرفتار تھے۔ بالآخر چنگیز خاں کے عہد کا خاتمہ ہوتا ہے اور اس کے بیٹے اس کی حکومت کو آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ پھر اس کا پوتا ہلاکو از سر نو دنیا کو فتح کرتا ہے اور بغداد پہنچ کر عباسی خلافت کی بساط لپیٹ دیتا ہے۔ غرض آٹھویں صدی ہجری میں یہ تباہ کاریاں تیمور لنگ کی یورشوں کی شکل میں دہرائی جاتی ہیں۔ لیکن ہلاکو اور اس کے پس ماندگان کی حکومت میں بھی ایرانی تہذیب و شخصیت کا اثر و نفوذ باقی رہتا ہے۔ نصیر الدین طوسی اپنی ہوش مندی اور علمی فراست کی بدولت ہلاکو کے دربار میں اثر و رسوخ حاصل کر لیتا ہے اور ہلاکو کی خواہش پر مراغہ کے اندر نجوم کے

مطالعے کا ایک مرکز قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ علمی رونق کا سامان کر کے مصنفین و شعراء کے لئے زندگی کا سامان مہیا کر دیتا ہے۔

یہاں ہم چنگیزی اور تیموری عہد کے تین ممتاز اشخاص کا ذکر کرتے ہیں، بلخ کے ایک عالم خوارزم شاہی سے رنجیدہ ہو کر خراسان سے اناتولیہ (ترکی) چلے گئے، وہاں ان کے بیٹے جلال الدین محمد کا غلغلہ مچ جاتا ہے جن کے اقوال مردہ دلوں میں زندگی کی روح پھونک دیتے ہیں اور شمس الدین تبریزی کی یاد میں نظم کی گئی ان کی غزلیں بیش قیمت دیوان کی شکل میں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہیں اور ان کی مثنوی معنوی سب سے بلند پایہ شعری و فکری تالیف سمجھی جاتی ہے۔ ایک جماعت مخالف بن کر سامنے آئی مگر جلد ہی میدان چھوڑ بیٹھی۔

اسی عہد میں شیراز میں وہ صاحب دل موجود تھا جو برسوں مختلف شہروں کی سیاحت کرنے کے بعد جب اپنے وطن واپس آیا تو علم و واقفیت اور تجربات کا بڑا ذخیرہ اپنے ساتھ لایا اور فارسی لٹریچر میں گلستان اور بوستاں جیسی کتابوں کا اضافہ کر گیا۔

شیخ سعدی دل آویز اور جاندار مضامین کو سادہ اور مانوس زبان میں سمو دیتے ہیں۔ ان کی گفتگو ہمیشہ زندگی کے حقائق کی تصویر کشی کرتی ہے اور عاشقانہ شاعری اس جذبے اور تعلق کو بیان کرتی ہے جو ہر عاشق کے رگ و پے میں روح کی طرح جاری و ساری رہتا ہے۔

سعدی کے سو سال بعد اسی شہر میں خواجہ حافظ کا ایسا غلغلہ بلند ہوتا ہے کہ "سیہ چشمانِ کشمیری" اور "ترکانِ سمرقندی" ان کی شاعری پر ناز سے رقص کرنے لگتے ہیں۔ اور شیراز کی نفاستی و سرشاری سے جھوم اٹھتی ہے۔ ریاکار لوگ اس کی زبان کے زخم سے ڈرتے ہیں۔ بازاروں اور گلی کوچوں کے لوگ بھی اپنی پسند کے مطابق ان کی شاعری کا مطلب نکال لیتے ہیں اور اس سے فال لیتے ہیں۔ خواجہ کی شاعری میں الفاظ نگینہ کی طرح جڑے ہوئے ہیں، اکثر اشعار کے دو یا تین مختلف مفہوم نکلتے ہیں کیونکہ

الفاظ کی ترکیب اس طرح کی گئی ہے کہ ان کے سادہ معنی بھی عبارت میں موجود ہوتے ہیں اور اصطلاحی معنی بھی جو صوفیوں اور مفکروں سے مخصوص ہیں ۔

جب عاشقانہ اور صوفیانہ غزلوں اور داستانوں کا شاعری میں رواج بڑھا اور عربی زبان کے الفاظ زیادہ استعمال ہونے لگے تو شاعری اور فن کا مرکز بھی خراسان سے ایران کے مرکزی اور جنوبی علاقے میں منتقل ہونے لگا' اور اصفہان، شیراز، ہمدان جیسے شہروں اور اناتولیہ کے دور دراز مقامات میں بھی شعرا کا جم غفیر نظر آنے لگا۔

اس عہد کے خاص اسلوب کو جو تیموری عہد کے خاتمے تک تھوڑے سے فرق کے ساتھ باقی رہتا ہے "اسلوب عراق" یا "مکتب عراقی" کہا گیا ہے ۔

عہد صفوی

چنگیزی اور تیموری عہد کے آخر میں ایران کے شمال غربی حصے سے اسماعیل نام کا ایک شخص اٹھتا ہے اور ایران کے ہر چہار گوشے میں صفوی حکومت کے جال بچھا دیتا ہے ۔ اس حکومت نے ایران کو نیا سماجی نظام ضرور دیا، لیکن اس نے ادب اور شاعری سے زیادہ سروکار نہیں رکھا۔ اسماعیل کا بیٹا تہماسپ اول' خود شاعر تھا اس کے باوجود وہ شاعروں سے کہتا ہے کہ عشقیہ اور مدحیہ شاعری سے دستکش ہو کر اہل کربلا کے ذکر میں مشغول ہو جاؤ۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ حضرت حسین رض کا سب سے زیادہ شور انگیز مرثیہ محتشم کاشانی کی بدولت اسی عہد میں وجود پاتا ہے ۔

اس عہد کی عشقیہ اور غزلیہ شاعری زیادہ پسند خاطر نہ بن سکی، اکثر شعرا سوز دل بیان کرنے کے لئے بعید تشبیہ و تعبیر اور پیچیدہ خیال آفرینی سے کام لیتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کی شاعری نہ صرف مشکل الفہم بلکہ کبھی کبھی مضحکہ خیز بھی بن گئی ہے مثلاً ایک شاعر اپنے معشوق کے جسم کی لطافت کو اس طرح بیان کرتا ہے :۔

چناں نازک بدن باشد کہ گر آری بگلزارش — بپا از سایۂ مژگان بلبل می خلد خارش

صفویوں کے عہد میں اس طرح کے اکثر شعرا ایران سے ہندوستان آئے اور یہاں ان کو اپنے فن کے مظاہرے کے لئے میدان ملا' اس لئے اس پیچیدہ اور دلچسپ مکتب کا نام "مکتب ہندی" رکھا گیا۔

افشاری زندی اور قاچاری عہد

بارہویں صدی ہجری میں تہماسپ قلی خاں افشار پوستین دوزی سے ملک گیری کے مرتبے پر پہنچ جاتا ہے اور "دشت مغاں" کے مقام پر ایک کانفرنس اس کو ایران کے حاکم مطلق کی حیثیت سے منتخب کر کے نادر شاہ کا لقب عطا کرتی ہے مگر اس کی نوبت بھی دیر تک نہیں بجتی اور ایران کے لوگوں کی تقدیر جلد ہی رعایا کے وکیل کریم خاں زند کے ہاتھ میں آجاتی ہے ۔ ان دونوں خاندانوں کے عہد حکومت میں شاعری اور ادب کو دربار میں داخل نہیں ہونے دیا جاتا' لیکن کچھ صاحب دل لوگوں نے اصفہان میں ایک انجمن قائم کر کے اس نئے نظریہ کا اظہار کیا کہ :۔

" ذہن سے بعید معانی اور لغو خیال آفرینی کی طرف رجحان نے شاعری کو پستی اور انحطاط میں مبتلا کر دیا ہے اسلئے اُس کے چکر سے نکلنے کے لئے مکتب قدیم کی طرف پلٹنا چاہئے ۔"

اس طرح انجمن اصفہان کے شعرا مکتب ہندی سے دور ہو جاتے ہیں اور ان میں سے اکثر اسلوب عراقی کو دوبارہ اپنی شاعری میں واپس لے آتے ہیں اور چند اشخاص دوبارہ اسلوب خراسانی کو سینے سے لگا لیتے ہیں۔ یہ "عہد بازگشت" تیرہویں صدی ہجری یعنی قاچاریوں کے عہد حکومت کے آخری برسوں تک جاری رہتا ہے اور اس کے بعد فارسی زبان کی انشا پردازی اور شاعری میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے ۔

اس عہد میں اخبارات لوگوں کے دلوں کی زبان بن جاتے ہیں اور مصنفین پہلی بار عوام کے لئے کتابیں لکھتے ہیں یہ نیا دور جو عہد قاچار کے خاتمے تک نیم جانی کے عالم میں رہتا ہے چودہویں شمسی صدی میں نئے ایران کے سماجی اسباب کے سایے میں طاقتور بنتا اور طرح طرح کے پھول پھل پیدا کرتا ہے

جن کے بارے میں ہم اپنی کتاب "جدید ایرانی ادبیات کا مطالعہ" میں گفتگو کریں گے۔

حواشی

[1] سنسکرت یعنی کابل سے ایران و یج؛ آریوں کی جائے پیدائش [2] بہت سے یورپی محققین خط کی پیدائش کا مقام فنیقیہ (موجودہ لبنان کے آس پاس) کو سمجھتے ہیں۔ لیکن ہندوستان اور ایران کی قدیم مذہبی اور رزمیہ روایات جو خط اور آریائی تمدن کے دوسرے مظاہر کے سرچشمے کا فنیقی تمدن سے بھی بہت زمانہ پہلے کا پتہ دیتی ہیں۔ ظہور اسلام سے پہلے کے مختلف ایرانی خطوط میں ایک خط جس کو دیسپ دبیری (تحریر عوام یا تحریر جامع) کہا جاتا رہا ہے، ۳۶۵ سے زیادہ صامت اور مصوت رکھتا تھا اور اتنا جامع تھا کہ تمام فطری آوازوں کو بھی اس کے ذریعے لکھا جایا کرتا تھا اور اس کے ذریعے پرندوں کی آواز، ندی کی گنگناہٹ نیز پالتو اور جنگلی جانوروں کی بولیوں کو بھی لکھنا ممکن تھا۔ [4] آرامی لوگ نہر اردن کے مشرق اور فلسطین کے جنوب میں رہتے تھے اور اس وقت آرامی خط کے نام سے جو کچھ موجود ہے وہ یورپی الف باسے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ زرتشت کے حروف ہجا اور دوسرے ایرانی خطوط اس سے زیادہ مکمل ہیں کہ آرامی یا فنیقی یا عربی خط سے ماخوذ ہوں۔ اصولی طور پر دنیا کے تمام خطوط کی اصل ایک نہیں ہے اور انسان کے ابتدائی خط ایک دوسرے سے الگ دنیا کے چند مختلف حصوں میں وجود میں آئے ہیں۔ [5] رودکی نے کتاب کلیلہ و دمنہ کو نظم کیا تھا لیکن اب اس کے بعض معمولی اجزا کے سوا کچھ موجود نہیں ہے۔ [6] انہیں برسوں میں لکھی گئی ایک اور کتاب بھی موجود ہے جس کا موضوع احکام فقہ سنی ہے۔

مراجع

(۱) تاریخ ادبیات فارسی۔ ڈاکٹر ہرمان ایتھے۔ ترجمہ ڈاکٹر رضا زادہ شفق (۲) سبک شناسی ج ۱، ۲، ۳ — ملک الشعراء محمد تقی بہار (۳) خط و فرہنگ۔ ذبیح اللہ بہروز (شامل مجموعہ ایران کودہ) (۴) تاریخ ادبیات ایران ڈاکٹر صادق رضا زادہ شفق (۵) خط و فرہنگ ایران ڈاکٹر عیسیٰ صدیق اعلم (۶) تاریخ ادبیات در ایران ج ۱، ۲ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا (۷) تاریخ سیستان۔ تصحیح ملک الشعراء بہار (۸) چہار مقالہ۔ نظامی عروضی سمرقندی۔

نظام نیشاپوری اور انکی تفسیر

غرائب القرآن و رغائب الفرقان

از

محمد عارف اعظمی عمری، رفیق دارالمصنفین،

ابتدائی حالات

نظام نیشاپوری کا نام حسن اور والد کا نام محمد تھا اور وہ نظام اعرج کے لقب سے مشہور تھے[1]۔ نیشاپور کے علاقے میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی[2]۔ ان کا آبائی وطن ایران کا مشہور شہر قم تھا[3]۔ ان کے مزید ابتدائی حالات کا ذکر نہیں ملتا، تاہم ان کی تصنیفات اور دوسرے مآخذ سے اس کا ثبوت ضرور ملتا ہے کہ وہ ساتویں صدی ہجری میں پیدا ہوئے اور آٹھویں صدی میں وفات پائی[4]، اس لیے صاحب روضات الجنات کا یہ بیان سہو پر مبنی ہے کہ نظام نیشاپوری علامہ ابن حجرؒ کے معاصر اور ہم پایہ ہیں[5]۔

علمی مرتبہ

نظام نیشاپوری اپنے عہد کے ایک ممتاز عالم اور صاحب تصانیف تھے۔ علم تصریف، ریاضی، ہیئت اور فلسفہ کے علاوہ فن تفسیر میں بھی ان کو مکمل دستگاہ حاصل تھی[6]۔ صاحب روضات الجنات کا بیان ہے۔

---

[1] روضات الجنات ورق ۲۲۲ و بغیۃ الوعاۃ ص ۲۳۰ [2] روضات الجنات ورق ۲۲۲ [3] ایضاً و بغیۃ الوعاۃ ص ۲۳۰ [4] مجوب الالباب فی تعریف الکتب والکتاب از خدا بخش خانصاحب ص ۴۰۳ [5] روضات الجنات ورق ۲۲۲ [6] ایضاً

فأمره في الفضل والأدب والتبحر
والتحقيق وجودة القريحة في
متأخري علماء العامة أشهر
من أن يذكر وأبين من أن
يسطر وكان من كبراء الحفاظ
والمفسرين[1]

متاخرین علماء میں فضل وکمال، علمی تبحر،
ادب وتحقیق اور ذہانت میں ان کی ذات
محتاج تعارف نہیں ہے، وہ بلند مرتبہ
حافظ اور مفسر تھے۔

نظام نیشاپوری کی سب سے اہم تصنیف "تفسیر غرائب القرآن ورغائب الفرقان" ہے اس کی اہمیت وجامعیت کا تذکرہ شاہ ولی اللہ محدثؒ دہلوی نے بھی کیا ہے[2]

عقیدہ ومسلک | نظام نیشاپوری مسلکاً شیعہ تھے[3]۔ اس کے ثبوت میں مندرجہ ذیل باتیں پیش کیجاتی ہیں۔

(۱) ان کا آبائی وطن مسلک شیعہ (امامیہ) کا مرکز قم تھا۔

(۲) ان کے نام الحسن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، نیز ان کے دادا کا نام حسین تھا۔

(۳) انھوں نے نصیر الدین طوسی کا تذکرہ بڑے والہانہ اور عقیدتمندانہ انداز میں کیا ہے اور ان کے جو القاب تحریر کیے ہیں وہ کسی دوسرے مسلک سے وابستہ شخص تحریر نہیں کر سکتا[4]۔

تفسیر غرائب القرآن کے مطالعہ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے، یہ تفسیر پانچ سال میں مکمل ہوئی ہے اور یہی حضرت علیؓ کی مدت خلافت بھی ہے، اس لیے اس کے زمانۂ تصنیف کو مدت خلافت حضرت علیؓ سے تعبیر کیا گیا ہے[5]۔ نیز اس میں ان کو ولی معظم کہا گیا ہے[6]۔ اور جابجا اہل بیت اور ائمہ شیعہ کی تحسین

۱۔ روضات الجنات ورق ۲۲۴ ۲۔ السر المکتوم ص ۵ مطبوعہ دہلی ۳۔ روضات الجنات ورق ۲۲۴
۴۔ روضات الجنات ورق ۲۲۴ ۵۔ تفسیر غرائب القرآن مطبوعہ برحاشیہ تفسیر طبری جلد ۳۰ ص ۲۳
۶۔ ایضاً ص ۲۰۴۔

ومدح سرائی کی گئی ہے[1]۔ اور اس کے مقابلہ میں بنو امیہ کی تنقیص[2] اور حضرت ابو بکرؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت اسماءؓ کا ذکر ادب واحترام سے نہیں کیا گیا ہے[3]۔ علاوہ ازیں کہیں کہیں شیعی مسلک کی توصیف اور اس کی اچھے انداز میں توجیہ بھی کی گئی ہے[4]۔

وفات | عام مورخین نے نظام نیشاپوری کی تاریخ وفات کی کوئی صراحت نہیں کی ہے، البتہ مشہور مستشرق بروکلمان نے ان کا سن وفات ۸۱۰ھ کے قریب بتلایا ہے[5]۔ مگر یہ محل نظر ہے کیونکہ علم ہیئت پر نصیر الدین طوسی کی کتاب "التذکرۃ النصیریۃ" کی انھوں نے جو شرح لکھی ہے وہ خود ان کے بیان کے مطابق ربیع الاول ۷۱۱ھ میں مکمل ہوئی[6]۔ پھر تفسیر غرائب القرآن کے آخری اجزاء کی تکمیل بھی انھیں کے بیان کے بموجب ۷۲۷ھ کے اواخر میں ہوئی[7]۔ حاجی خلیفہ کے ایک بیان کے مطابق ان کا انتقال ۷۲۸ھ میں ہوا[8]۔ ہمارے خیال میں یہی بیان زیادہ قرین قیاس ہے

تصنیفات | نظام نیشاپوری نے تفسیر کے علاوہ علم تصریف، ہیئت اور علم ریاضی میں بھی بعض کتابیں اور زیادہ تر شرحیں لکھیں، پہلے ہم ان کی عام تصنیفات کے نام تحریر کرتے ہیں اور آخر میں تفسیر کا کسی قدر مفصل تعارف کرائیں گے۔

۱- شرح الشافیۃ لابن حاجب :- صرف میں ابن حاجب کی الشافیہ مشہور کتاب ہے، یہ اس کی مفید شرح ہے[9]۔ جو طلبہ میں شرح نظام کے نام سے مشہور ومتداول تھی[10]۔

۱۔ تفسیر غرائب القرآن مطبوعہ برحاشیہ تفسیر طبری جلد ۳۰ ص ۱۱۹، ۱۷۷، ۱۷۹، ۱۹۳ ۲۔ ایضاً جلد اول ص ۷۷-۷۸ وجلد ۳۰ ص ۱۷۵-۱۸۹ ۳۔ ایضاً جلد ۳۰ ص ۱۸۵، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹ ۴۔ ایضاً جلد ۶ ص ۱۴۴ ۵۔ بحوالہ فہرست کتب انڈیا آفس جلد دوم ص ۸۴ مرتبہ سی اے اسٹوری ۶۔ ایضاً ۷۔ تفسیر غرائب، سورہ القدر مخطوطہ ۱۱، لینفلس ۸۔ کشف الظنون جلد ثانی ص ۱۱۹۵ مطبوعہ استنبول ۹۔ بغیۃ الوعاۃ ص ۲۳۰ ۱۰۔ روضات الجنات ورق ۲۲۳

۲۔ شرح تحریر المجسطی:۔ نصیر الدین طوسی کی کتاب "تحریر المجسطی" کی یہ شرح ہے۔ جو شعبان سنہ ۷۰۴ھ میں پایۂ تکمیل کو پہونچی[1]

۳۔ شرح التذکرۃ النصیریۃ:۔ یہ علم ہیئت میں ہے اور نصیر الدین طوسی کے "التذکرۃ" کی شرح ہے[2]۔ یہ ربیع الاول سنہ ۷۱۱ھ میں مکمل ہوئی[3]۔ حاجی خلیفہ کا بیان ہے کہ مختصر ہونے کے باوجود یہ جامع شرح ہے[4]۔

۴۔ الشمسیۃ فی الحساب:۔ یہ رسالہ علم حساب میں ہے جس کا انتساب وزیر رشید الدین فضل اللہ کے فرزند عبد اللطیف کی جانب کیا گیا تھا[5]۔ ایک روایت کے مطابق شیخ بھائی نے اس رسالہ کی تلخیص کی ہے[6]۔

۵۔ لب التأویل:۔ مصنف کی یہ ایک دوسری تفسیری تصنیف ہے جو ایک جلد میں ہے، اس میں آیات کے تفسیری مباحث سے تعرض کیے بغیر ان کی تاویلیں یکجا کر دی گئی ہیں[7]۔ صاحب کشف الظنون نے ایک اور تفسیر ان کی جانب منسوب کی ہے اور اس کا نام "بصائر" بتایا ہے جو فارسی میں ہے[8]۔

۶۔ تفسیر غرائب القرآن و رغائب الفرقان:۔ یہ نظام نیشاپوری کی سب سے اہم تصنیف ہے، مصنف کا طریقہ یہ ہے کہ وہ پہلے قرأتوں کے اختلاف کا ذکر کرتے ہیں پھر اوقاف و رموز بیان کرتے ہیں اس کے بعد آیات کی تشریح کرتے ہیں، اس تفسیر کا اصل ماخذ تفسیر کبیر امام رازی اور تفسیر کشاف ہے[9]۔ غالباً اسی بناء پر بعض لوگوں نے اسے تفسیر کبیر کی تلخیص قرار دے دیا ہے[10] مگر بروکلمان نے یہ تحریر کیا ہے کہ یہ تفسیر کبیر کی تلخیص نہیں بلکہ نظام نیشاپوری کی مستقل تصنیف ہے[11]

---

[1] فہرست انڈیا آفس جلد دوم ص ۴۸ [2] روضات الجنات ورق ۲۲۴ [3] انڈیا آفس جلد دوم ص ۴۸ [4] کشف الظنون جلد اول ص ۳۹۲ [5] انڈیا آفس ص ۴۸ [6] روضات الجنات ورق ۲۲۴ [7] ایضاً [8] کشف الظنون جلد اول ص ۳۰۳، ۳۱۶ [9] تفسیر غرائب جلد اول ص ۶ [10] فہرست کتب خانہ خدیو مصر جلد اول ص ۱۰۳ [11] فہرست انڈیا آفس ص ۴۸۔

انھوں نے اس کی بھی تردید کی ہے کہ اس تفسیر کے مولف حسن بن محمد بن حبیب نیشاپوری ہیں جیسا کہ کچھ لوگوں کا گمان ہے[1]۔

اس تفسیر کے متعدد قلمی نسخے انڈیا آفس لندن[2] برٹش میوزیم[3] کتب خانہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ صاحب حیدر آباد[4] اور کتب خانہ دار العلوم دیوبند میں موجود ہیں[5] ایک نامکمل نسخہ از سورہ یوسف تا سورہ الناس کتب خانہ دار المصنفین میں بھی ہے۔ سنہ ۱۳۲۱ھ میں مطبعہ میمنیہ مصر سے تفسیر طبری کے حاشیہ پر یہ تفسیر طبع بھی ہو چکی ہے اور یہی ہمارے پیش نظر ہے۔ اس کے علاوہ ایران سے بھی اس کے کئی نسخے چھپ چکے ہیں۔ ذیل میں اس کی بعض خصوصیات بیان کی جاتی ہیں۔

تفسیر غرائب القرآن ترتیب و مواد کے لحاظ سے عمدہ اور جامع تفسیر ہے، اس میں عقلی مباحث تفسیر کبیر سے اور نحو و بلاغت سے متعلق امور کشاف سے جمع کیے گئے ہیں مگر مصنف نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس میں جا بجا دونوں ائمہ تفسیر سے اختلاف کر کے خود اپنی رائے بھی دی ہے[6]۔ صاحب روضات الجنات کے خیال میں یہ تفسیر تفسیر طبری کے ہم پایہ ہے۔[7] اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگاروں نے بھی اسے تفسیر کبیر اور کشاف کے برابر کی کتاب قرار دیا ہے[8]۔

آیات کا ترجمہ اس تفسیر کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں آیتوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے چنانچہ اس کے ایران سے شائع ہونے والے نسخوں میں اور مولانا مناظر احسن گیلانی کے بیان کے مطابق بعض مخطوطات میں بھی آیات کا فارسی ترجمہ موجود ہے[9] البتہ تفسیر طبری

---

[1] فہرست انڈیا آفس ص ۴۸ [2] ایضاً [3] فہرست مخطوطات عربی برٹش میوزیم ص ۷۰، مرتبہ چارلس ریو [4] بحوالہ التذکرۃ المفسرین، از قاضی محمد زاہد الحسینی ص ۱۲۳ [5] تعارف مخطوطات کتب خانہ دار العلوم دیوبند ص ۵۴ [6] تفسیر غرائب جلد ۳ ص ۲۷، ۳۹ [7] روضات الجنات ورق ۲۲۴ [8] اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ششم ص ۱۵۳ مقالہ تفسیر مقالہ نگار سید مرتضیٰ حسین و عبد المنان عمر [9] ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول ص ۲۴۲ بحوالہ مجلہ علوم القرآن جلد نمبر ۱ شمارہ ۵ نمبر ۲ مقالہ علم قرآن عہد سلطنت کے ہندوستان میں از ڈاکٹر ظفر الاسلام

کے حاشیہ پر مصر سے اس کا جو نسخہ طبع ہوا ہے اس میں فارسی ترجمہ درج نہیں ہے مگر خود مصنف کے بیان میں اس کی صراحت موجود ہے کہ انھوں نے آیتوں کا ترجمہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"ہم نے پہلے قرآن مجید کا متن درج کیا ہے اور اس کا خوب واضح سلیس اور جامع ترجمہ فارسی بھی کردیا ہے۔ جس میں محذوفات و مقدرات کو ظاہر کرنے کے ساتھ متشابہ آیات کی تاویل و تشریح کنایوں کی تصریح اور مجاز و استعارہ پر مبنی لفظوں اور جملوں کی تحقیق بھی کردی گئی ہے۔ کیونکہ محض سادہ طور کے ترجموں سے اشک رواں ہوتے ہیں اور مترجمین بھی ان میں لغزشیں سرزد ہوتی ہیں، کیونکہ بسا اوقات ان کے بعض اسرار اور رموز عربی زبان کے ماہرین کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں چہ جائیکہ وہ عجمی جو عربی علوم سے بے بہرہ ہو"[1]

مندرجہ بالا بیان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نظام نیشاپوری کا ترجمہ محض لفظی نہ تھا۔ اس لیے بعض مخطوطات میں فارسی ترجمہ موجود نہ ہونے کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ ان کے ناقلین فارسی سے ناواقف رہے ہوں گے۔ غالباً اسی بناء پر اس قسم کے مخطوطات میں آیتوں کے درمیان یک گونہ خلاء موجود ہے۔[2]

تفسیر غرائب کی ہندوستان میں تکمیل اور اس کے مولف کے ہندی الاصل ہونے کی بنیاد

تفسیر غرائب القرآن کے بارہ میں اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگاروں کا یہ خیال ہے کہ اس کی جلد اول و سوم ۷۳۰ھ/۱۳۳۰ء اور جلد دوم ۱۱ محرم الحرام ۷۲۸ھ میں مکمل ہوئی کیونکہ تہران سے شائع شدہ اس کے نسخوں کی ہر ہر جلد کے آخر میں ترقیمہ ہے۔[3] بعض لوگوں کے بیان کے مطابق تفسیر کا آخری حصہ پہلے ۷۲۸ھ میں اور ابتدائی حصہ اس کے بعد ۷۳۰ھ میں تحریر ہوا ہے

[1] تفسیر غرائب جلد اول ص ۶ [2] مثلاً دیکھیے مخطوطہ دار المصنفین از قلم سید نصر اللہ بن سید صالح الاز قولی [3] اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ششم ص ۵۳۱۔

اور ان کا یہ بھی خیال ہے کہ غرائب القرآن ہندوستان کے شہر دولت آباد دکن میں مکمل ہوئی ہے۔[1] اس کے ثبوت میں سورہ نساء کی تفسیر کے اختتام کی درج ذیل عبارت کو پیش کیا گیا ہے۔

كتب المصنف في نسخته علقه مؤلفه	مصنف نے اپنے نسخے میں لکھا ہے کہ
الحسن بن محمد حسن المشتهر	اس کتاب کے مولف حسن بن محمد بن
بنظام نيشاپوري ببلاد الهند	حسن مشہور بہ نظام نیشاپوری نے
في دار مملكتها المحروسة دولت	اس کو دیار ہند میں وہاں کے پایہ تخت
آباد في اوائل صفر سنة ۷۳۰ھ[2]	دولت آباد میں صفر ۷۳۰ھ کے
	اوائل میں لکھا ہے۔

یہاں چند باتیں غور طلب ہیں اول تو یہ عبارت مصنف کے بجائے تفسیر کے جامع کی ہے، اسی بناء پر یہ توسین میں درج ہے، دوم اس سے تفسیر کی ترتیب معکوس کا پتہ چلتا ہے جس کی تائید خود تفسیر سے نہیں ہوتی بلکہ اس میں اکثر ماقبل سورتوں کے حوالے اس طور پر دیے گئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے ترتیب اصلی کے مطابق لکھا گیا تھا،[3] علاوہ ازیں ترتیب معکوس کی تعیین تمام نسخوں میں یکساں نہیں ہے، یہ امر بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ حاجی خلیفہ نے مصنف کے انتقال کا سال ۷۲۸ھ بتایا ہے جو اس لیے درست ہو سکتا ہے کہ مولف کے بیان کے مطابق وہ اپنی تفسیر ۷۲۷ھ

[1] اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ششم ص ۵۳۱ و ڈاکٹر ظفر الاسلام مقالہ علم قرأت عہد سلطنت کے ہندوستان میں [2] تفسیر غرائب جلد ۶ ص ۳۹ [3] مثال کے طور پر ملاحظہ ہو جلد ۱۲ ص ۸۸، جلد ۱۳ ص ۹،۱۶ اور جلد ۳۰ ص ۲۲-۳۴-۳۵-۳۶-۱۲۵۔

کے اواخر میں تقریباً مکمل کرچکے تھے۔

مولف کے ہندوستان آنے اور دولت آباد میں اپنی تفسیر کو مکمل کرنے کی تردید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اس عہد کے مورخین و ارباب سیر نے ان کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے، اس زمانہ میں محمد شاہ تغلق کی حکومت تھی، اس کے دور حکومت کے بارے میں جو کتابیں ابھی تک لکھی گئی ہیں ان میں اس عہد کے علماء و مشائخ اور ناموران علم و فن کے ساتھ نظام نیشاپوری کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ وہ خود بھی نہ اپنے کو دولت آبادی لکھتے ہیں اور نہ تفسیر کے ناقلین ہی نے اس کی کوئی صراحت کی ہے بلکہ یہ سب انھیں نظام نیشاپوری ہی لکھتے ہیں[1] اس لیے محض تنہا اس عبارت کو ان کے ہندی الاصل ہونے کی بنیاد نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ تفسیر غرائب القرآن کے ایک کاتب سید نصر اللہ بن سید صالح الازفولی نے اس تفسیر کا نام "انوار التنزیل" لکھ دیا ہے[2] اور یہ تفسیر کے مطبوعہ مصری ایڈیشن کے آخر میں طبع بھی ہوگیا ہے[3] حالانکہ خود مولف کے بیان کے مطابق اس تفسیر کا نام "غرائب القرآن و رغائب الفرقان" ہی ہے[4]۔

مدت تصنیف یہ تفسیر پانچ برسوں میں مکمل ہوئی اور حضرت علیؓ کی خلافت بھی پانچ برس رہی، اس لیے مولف نے اس کے زمانۂ تصنیف کو مدت خلافت حضرت علیؓ سے تعبیر کیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ تفسیر دو سال میں مکمل ہوجائے گی جس کو انھوں نے مدت خلافت حضرت ابوبکرؓ سے تعبیر کیا ہے مگر اسفار کی کثرت اور دوسرے موانع کی وجہ سے اس مدت میں تفسیر مکمل نہ ہوسکی اور پانچ سال کا عرصہ گذر گیا[5]۔

---

۱ تفسیر غرائب القرآن خاتمہ جلد ۳۰ ۲ ایضاً مخطوطہ دار المصنفین ۳ ایضاً مطبوعہ مصر خاتمہ جلد ۳۰
۴ تفسیر غرائب جلد اول ص ۱۰ و خاتمہ جلد ۳۰ ۵ ایضاً جلد ۳۰ ص ۲۰۳۔

ماخذ اس تفسیر کے اولین ماخذ میں تفسیر کبیر اور کشاف کا پہلے ذکر ہوچکا ہے ان کے علاوہ یہ کتابیں بھی ان کے پیش نظر رہیں جن کا ذکر انھوں نے اپنے مقدمہ میں کیا ہے، (۱) علم اوقاف میں امام سجاوندی کی کتاب[1] (۲) سبب نزول کے بیان میں جامع الاصول اور تفسیر واحدی[2] (۳) علم لغت میں صحاح الجوہری (۴) علم معانی و بیان اور ادبی مسائل میں المفتاح اور بعض دوسرے مراجع (۵) شرعی احکام کے اخذ و نقل میں فقہ کی معتبر کتابیں بالخصوص امام رافعی کی شرح الوجیز[3] (۶) اور فن تاویل میں زیادہ تر نجم الدین ابوبکر عبداللہ بن محمد الاسدی مشہور بہ دایہ کی بحر الحقائق والمعانی سے استفادہ کیا گیا ہے[4]۔

منہج تفسیر نظام نیشاپوری گو مسلکاً شیعہ تھے، مگر تفسیر کے بنیادی عقائد و امور میں ان کا یہ دعوی ہے کہ انھوں نے اہل سنت والجماعت کی پیروی کی ہے، البتہ فروعی مسائل میں انھوں نے تعصب اور جانبداری سے کام لیے بغیر دوسرے فرقوں کے دلائل بھی نقل کر دیے ہیں[5]، گو یہ دعوی محل نظر ہے تاہم مجموعی طور پر تفسیر غرائب القرآن نظام نیشاپوری کا ایک بڑا علمی کارنامہ ہے اور اگر یہ صحیح ہے کہ وہ ہندوستان میں وارد ہوئے اور یہاں انھوں نے اس تفسیر کے بعض حصوں کی تکمیل کی تو پھر چاہے وہ سرزمین ہند کے پہلے مفسر نہ کہے جائیں مگر پہلے مترجم قرآن ہونے کا سہرا انھیں کے سر بندھتا ہے۔

---

۱ مولف کا پورا نام محمد بن طیفور سجاوندی غزنوی ہے، اس کتاب کا ایک ناقص قلمی نسخہ کتب خانہ دار المصنفین میں موجود ہے ۲ مولف کا نام علی بن احمد بن محمد بن علی الواحدی ہے جمادی الاخری ۴۶۸ھ میں بمقام نیشاپور وفات پائی، انکی کتاب "اسباب النزول" ۱۳۱۵ھ میں قاہرہ سے چھپ چکی ہے (تذکرۃ المفسرین از قاضی محمد زاہد الحسینی ص ۸۵) ۳ امام غزالی کی کتاب "الوجیز" کی یہ بہت مفصل اور جامع شرح ہے اسکے مولف ابو القاسم عبد الکریم بن محمد القزوینی الرافعی الشافعی متوفی ۶۲۳ھ ہیں اس شرح کا نام انھوں نے "فتح العزیز علی کتاب الوجیز" رکھا تھا (کشف الظنون جلد ۲ ص ۲۰۰۲، ۲۰۰۳ مطبوعہ استنبول) ۴ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری میں موجود ہے، ملاحظہ ہو فہرست مخطوطات جلد ۱۸ ص ۱۳۶-۱۳۷ ۵ تفسیر غرائب جلد ۳۰ ص ۲۰۳

منشی درگا سہائے سرور جہاں آبادی

از

جناب بسنت کمار بسنت ایڈوکیٹ رکاب گنج الکھنؤ

اردو نظم کے بہترین، ممتاز، قابلِ قدر اور عظیم شعرا میں درگا سہائے سرور جہاں آبادی کا نام صفِ اوّل میں آتا ہے، انہوں نے اردو نظم کو ایک نیا اسلوب اور نیا آہنگ دیا۔ ان کے منفرد لب و لہجہ اور اچھوتی تشبیہات اور استعاروں نے اس میں ایک نئی روح پھونک دی۔ انہوں نے فطرت کے حسین و جمیل مناظر کو زبان کی خوشبو اور چاشنی سے بہت مالا مال اور دلچسپ بنا دیا۔ اردو الفاظ کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہندی کلچر، ریت، رواج اور ہندوستانیت کا جو رس اور مٹھاس اپنے لہجہ میں گھول دی اس کی دلفریبی اور بانکپن آج بھی نمایاں اور سامع اور قاری کو مسحور کر دیتی ہے۔

سرور کی ولادت ضلع پیلی بھیت میں ۱۸۷۳ء میں ہوئی۔ ان کے والد حکیم پیارے لال صاحب قصبہ جہاں آباد کے زمیندار تھے۔ ان کا شمار یہاں کے رؤسا میں تھا وہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے نامور ممبر بھی تھے۔ سرور کی تعلیم تحصیل جہاں آباد میں ہوئی جہاں انہوں نے اردو مڈل اور انگریزی میں انٹرنس تک تعلیم حاصل کی بعد ازاں مولوی سید کرامت حسین صاحب بہار سے فارسی کی کتابیں پڑھیں اور فنِ شعر میں بھی انہیں سے اصلاح لی۔ سرور کو شعر و سخن سے بچپن ہی سے دلچسپی تھی۔ فکر و مطالعہ میں اکثر وقت گزارتے تھے۔ انہوں نے حضرت بیانؔ اور یزدانی میرٹھی کے کلام کو پسند کیا اور اپنے آپ کو ان کا شاگرد معنوی سمجھنے لگے۔ پہلے وحشتؔ تخلص کرتے تھے پھر سرورؔ تخلص قرار دیا۔

حصولِ تعلیم کے بعد بجنور کے ایک رئیس کے صاحبزادے کی تعلیم پر مامور ہوئے اور دو تین سال تک رسالہ "زمانہ" کانپور کے دفتر میں رہے پھر اپنے وطن جہاں آباد میں آکر آبائی پیشہ مطب شروع کیا

مگر اس کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ خدمتِ خلق ان کا اصل مقصد تھا فیس کسی سے قبول نہ کرتے۔

سرورؔ مرحوم متواضع، نیک طبیعت اور راست باز تھے وہ ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ شعر و سخن ہر وقت ان کی دلبستگی کا مشغلہ تھا۔ ان کو یہ فکر کبھی دامن گیر نہ رہی کہ وہ بڑے رئیس اور دولت مند ہو جائیں۔ وہ صرف شاعر تھے اور ایسے خوش فکر شاعر جو اپنی دنیا کا آپ بادشاہ تھا۔ انہیں جز شاعری دنیا کی کسی اور شئے کی احتیاج نہ تھی وہ دنیائے فانی کی لمحہ بھر کی خوشی کے کبھی متمنی نہ ہوئے۔

سرورؔ اپنی نظم "بے ثباتی دنیا" میں اپنے تاثرات کو یوں پیش کرتے ہیں :-

بھری پن کوٹ کی نیرنگیاں ہزار ہزار — کہ ہے مرقع عبرت طلسم لیل و نہار
خرام ناز سے فتنے اٹھا رہا ہے فلک — مٹا رہا ہے زمانے کو اف یہ کج رفتار
چمن میں چلتی تھی دامن اٹھا کے جن کا نسیم — اڑائے پھرتی ہے صحرا میں ان گلوں کا غبار
عروسِ دہر نہیں التفات کے قابل — نظر سے کہہ دو دکھائے فریبِ نقش و نگار

سرورؔ ایک قوم پرست اور محب الوطن تھے جو اپنے ملک کو فرنگی حکومت کی غلامی سے آزاد کرانا چاہتے تھے اس لیے وہ حریت، مساوات، قوم کی فلاح و بہبود اور ملک کی سالمیت کا پرچم لے کر اٹھے تھے انہیں غربت و عسرت سے ملک کو نجات دلانے کی فکر دامن گیر تھی۔ مگر وہ شورش و انقلاب اور جبر و تشدد کے بجائے سکون و امن کے قائل تھے، قومیت کا یہ بے لوث جذبہ ان کی نظموں میں صاف جھلکتا ہے۔ اپنے جذبہ "حب وطن" کو سرورؔ اپنی مشہور نظم "بندے ماترم" میں یوں پیش کرتے ہیں۔

اف یہ تیری چاندنی راتوں کا منظر خوشنما — آہ یہ اشجار یہ پھولوں کا زیور خوشنما
سو تبسم تیرے اندازِ تکلم پر نثار — دل کو کرتی ہیں تری شیریں ادائیں بیقرار

سرزمینِ عیش ہے اے مادرِ دلسوز تو
آرزوؤں کی ہے بزم انبساط افروز تو

تیرا دیو استھان دیوی دل کے کاشانے میں ہے
تیری تصویر مقدس ہر صنم خانے میں ہے

لکشمی تو ہے زمانے میں اجالا ہے ترا
ہر کنول کا پھول پانی میں شوالا ہے ترا

سرسوتی کا روپ ہے درگا کا ہے اوتار تو
نطق و دانش کی ہے دیوی مادرِ غمخوار تو

"خاکِ وطن" سے سرور صاحب کو کس قدر محبت تھی یہ بات ان کی نظم "خاکِ وطن" سے عیاں ہے۔

آہ! اے خاکِ وطن اے سرمۂ نور نظر
آہ! اے سرمایۂ آسائشِ جان و جگر

تیرے دامن میں شگفتہ تھے کبھی قدرت کے پھول
گندھ رہے تھے تیری چوٹی میں وحدت کے پھول

جب مسلط خلق پر تھی خوابِ غفلت کی گھٹا
موتی برساتی تھی تجھ پہ ابرِ رحمت کی گھٹا

لوٹتا شب بھر قمر تھا سبزہ زاروں میں ترے
کھیلنے آتا تھا سورج آبشاروں میں ترے

رموزِ وحدت سے آشنا ہونے اور تجسس عارفانہ کے خاموش شعوری جذبہ کا اندازہ ان کی نظم "حمدِ باری" سے صاف ظاہر ہے۔

اک عمر بتکدے میں رگڑا کیا جبیں برسوں
کعبے میں بن کے بیٹھا اکثر حرم نشیں میں

برقِ خیال بن کر دوڑا تہہ زمیں میں
تاروں کی انجمن میں برسوں رہا مکیں میں

لیکن کہیں تجلی تیری نظر نہ آئی
وہم و گماں سے یارب! تیری نہ تھاہ پائی

جنگل میں جا کے برسوں دھونی رما کے بیٹھا
پربت پہ بن کے جوگی آسن جما کے بیٹھا

صحرا کی وادیوں میں آنکھیں بچھا کے بیٹھا
تیرے لئے جہاں سے میں ہاتھ اٹھا کے بیٹھا

ڈھونڈھا کیا تجھے میں بیراگیوں میں برسوں
بیٹھا فقیر بن کر میں تیاگیوں میں برسوں

سرور ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ دیاشنکر نسیم کے بعد اہلِ ہنود میں جو مقبولیت ان کو نصیب ہوئی وہ کسی اور کو نہیں ملی۔ ان کی شاعری فطرت کی رنگارنگ تصاویر اور دل افروز نقوش کا ایک خوبصورت البم ہے جو سامعین کے دلوں کو موہ لیتی اور مسحور کر دیتی ہے اور ان کے ذہن و دماغ پر ایک کیف آگیں اور نہ مٹنے والا تاثر چھوڑ دیتی ہے۔ ان کے گلدان سخن میں ایسے ایسے خوشبودار اور خوشنما پھول ہیں جن کی خوشبو دل و دماغ کو سکون اور روح کو تازگی اور شگفتگی بخشتی ہے۔

نیچرل نظم کے موجد اگرچہ پروفیسر آزاد مرحوم اور شمس العلماء مولانا حالی ہیں مگر سرور مرحوم نے اپنی تخیل کی گہرائی اور لفظوں کی آرائش سے نیچرل نظم کو ایک نیا روپ دیا اور نئی چاشنی پیدا کی۔ انہوں نے فی الواقع نیچرل نظم کو ایشیائی شاعری کی رنگینی سے بہت کچھ نکھارا اور دلآویز بنایا۔ اور ان کے کمالِ فن نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ اپنے جداگانہ لہجہ و اسلوب، منتخب الفاظ، استعارات و کنایات کے بکثرت اور خوبصورت استعمال سے انہوں نے نیچرل نظم کو بیحد پُر کیف بنایا اور اس میں ایک نئی روح پھونک دی۔

انہوں نے اردو نظم کے گلستاں کو الفاظ کے گل و نجوم و جواہر سے مالامال کر کے اردو نظم کو ایک نیا موڑ دیا اس اعتبار سے ان کو اردو کا ورڈ سورتھ کہا جا سکتا ہے۔

فارسی کی انوکھی ترکیبیں بھی ان کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ غزل گوئی کی جانب انہوں نے گو توجہ نہیں کی مگر ان کی کوئی نظم ایسی نہیں ہے جس کو تغزل کی رنگ آمیزی نے شوخ نہ بنا دیا ہو۔ سرور کے کلام میں سوز و گداز، تخیل کی گہرائی۔ مناظرِ فطرت کی ہو بہو عکاسی کے ساتھ ساتھ خیالات کی فراوانی اور متنوع مضامین بھی ان کی سخن پروری اور نکتہ پردازی کا ایک معجزہ ہیں۔

ان کی نظم میں اردو کے ساتھ ہندی کے سہل، شیریں اور عام فہم الفاظ کا خوبصورت امتزاج بھی ہے۔ سرور جہاں آبادی کی حیات اور شاعری جس پر ڈاکٹر حکم چند نیر کو بنارس ہندو یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی

کی ڈگری تفویض کی گئی وہ لکھتے ہیں۔

"سرور اردو فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی زبان وادب سے پوری واقفیت رکھتے تھے۔ سنسکرت سے بھی نا آشنا نہ تھے، انہوں نے ہندوستان کی قدیم وجدید تاریخ کو بڑے غور سے پڑھا تھا۔ وہ ہندو عقائد رسم ورواج، مذہب و تمدن، روایات اور دیومالا سے جذباتی وابستگی پیدا کر سکتے تھے۔"

سرور نے ملک کی فضا اور ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے ہندی ترکیبیں، بندشیں اور الفاظ استعمال کئے ہیں۔ تشبیہوں اور استعاروں سے ایسی فضا پیدا کی ہے جس کے تمام خدوخال اور نقوش ہندوستان کی پرچھائیاں لئے ہوئے ہیں۔ جدید شعراء میں شاید ہی کسی شاعر نے سرور سے زیادہ ہندی الفاظ ترکیبیں اور تشبیہیں اردو میں اس خوش اسلوبی سے استعمال کی ہوں۔

ڈاکٹر حکم چند نیر نے جو تحقیقی مقالہ سرور جہاں آبادی کے اسلوب اور فن شاعری پر لکھا ہے اس پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں۔

"درگا سہائے سرور جہان آبادی اردو نظم کے اوّلین معماروں میں تھے۔ انہوں نے مختصر عمر پائی اور شباب ہی میں رخصت ہو گئے۔ لیکن اپنے کلام کا جو سرمایہ انہوں نے یادگار چھوڑا ہے وہ اپنے کیف و سرمستی اور لطف و اثر سے ہمیشہ دلوں کو کھینچتا رہے گا۔ آزاد اور حالی نے جس شاعری کی بنیاد ڈالی تھی سرور اور ان کے ہم عصر شعراء نے اس پر ایک عظیم الشان عمارت کھڑی کی۔ سرور کے موضوعات کا عام انداز اپنے دور کے شاعروں سے ہم آہنگ بھی ہے اور مختلف بھی۔

سرور کو اپنی مختصر زندگی میں پے بہ پے آلام اور صدموں کا سامنا رہا۔ ان کی اہلیہ جن سے انہیں گہری محبت تھی چھبیس برس کی عمر میں داغ مفارقت دے گئیں۔ اس کے

بعد انہوں نے نہ تو کوئی دوسری شادی کی اور نہ کہیں تعلق ہی پیدا کیا۔ ان کا دل خون گشتہ تمناؤں کا گھر بن کر رہ گیا تھا اور اس کا اثر ان کے کلام پر معکوس طور پر پڑا ہے۔ سرور جس چیز پر بھی نظر ڈالتے تھے وہ انہیں دلہن کی طرح حسین معلوم ہوتی تھی۔ شباب سے سرشار اور محبت سے چور ان کی پوری شاعری پر اس تصور کی چھوٹ پڑتی معلوم ہوتی ہے۔"

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ آگے فرماتے ہیں:۔

"خاکِ وطن کا بیان، عظمتِ ہند کا ذکر ہو یا مناظرِ فطرت کی تصویر کشی ان کا تخیل اکثر و بیشتر خارجی آثار و کوائف کی تجسیم کر کے ایک پری پیکر نازنین کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ موضوع چاہے کچھ بھی ہو اور خیال کیسا ہی ہو سرور ہر شے کو حسن کے مرقعے میں ڈھالنے اور اسے مجسم حسن کی حیثیت سے پیش کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔"

سرور اور ان کے بعد کے شاعروں میں فرق یہی ہے کہ سرور کی وطنی شاعری کا رنگ و آہنگ سیاسی کے بجائے جمالیاتی ہے اس لحاظ سے وہ یقیناً قابلِ قدر ہیں کہ انہوں نے وطن کا تصور ماں کی حیثیت سے، دیوی کی حیثیت سے اور محبوب کی حیثیت سے کیا ہے۔ عقیدے کے اعتبار سے سرور آریہ سماجی رہے ہوں گے لیکن بت پرستی ان کی خمیر میں تھی۔ ان کی شاعری کے لطف و اثر کا سرچشمہ ابھی تک تازہ و شیریں ہے اور تین چوتھائی صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اس کی کشش باقی رہنے کی وجہ ان کا یہی تمثیلی طرز تھا۔ رفیق مارہروی کا بیان ہے۔

"سرور نے ہندوستان کے جادو مثال شاعر کالی داس کی نظموں کو اردو کا جامہ پہنایا اور اس طرح کالی داس کے پیغام کو عمر دوام بخشی۔ لیکن اس حقیقت کے دوش بدوش یہ واقعہ کس قدر اندوہناک ہے کہ سرور کی غربت و تنگدستی نے اسے ایک وقت اتنا مجبور کر دیا کہ اس کی یہ بے مثال نظمیں دوسرے لوگوں کے نام سے شائع ہوئیں۔"

رام بابو سکسینہ اپنی کتاب "تاریخ اردو ادب" میں لکھتے ہیں۔

"سرور کا بہت سا کلام ضائع ہو گیا یا شاعروں اور کم مایہ لوگوں نے ہتھیا لیا، کبھی حقیر معاوضہ دے کر اور کبھی معاوضہ دیئے بغیر۔"

جگر بریلوی رقمطراز ہیں:۔

"سرور کی بے شمار رباعیاں پیارے لال شاکر میرٹھی کے نام سے شائع ہوئیں انہیں نظموں میں ایک مجموعہ "اکسیر سخن" ہے جو کالیداس کے "رتو سنگھار" کا ترجمہ ہے اور نیچرل شاعری کا بے نظیر مجموعہ ہے۔"

لالہ سری رام دہلوی لکھتے ہیں:۔

"اور سب سے زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ سرور نے اپنے کلام بیش بہا کو کوڑیوں کے مول فروخت کیا اور ہندوستان کے جادو مثال شاعر کالیداس کی نظموں کو اردو کا لباس پہنا کر ایسے لوگوں کے نام منسوب کیا جو ان کی باریکی، نازک خیالی اور لطافت کو سمجھنے سے بھی قاصر تھے۔"

سرور جہاں آبادی کا کلام جو شاکر میرٹھی کے نام سے اکسیر سخن میں شائع ہوا ہے اس کے متعلق منشی پریم چند نے جو خط منشی دیا نرائن نگم کو لکھا وہ انہوں نے زمانہ اگست ۱۹۱۶ء میں شائع کیا ہے جس نے یہ راز افشا کر دیا۔ منشی پریم چند لکھتے ہیں۔

"مشفق من تسلیم

آپ نے سرور مرحوم کے نام جو خطوط اور حضرت شاکر نے جو مسودے میرے پاس بھیجے ہیں انہیں دیکھنے کے بعد مجھے آپ سے قطعی اتفاق ہے کہ ان نظموں کے اصلی مصنف سرور ہیں۔"

نظم "لکشمی جی" سرور کی مشہور نظم ہے جس میں عورت کے جمالیاتی حسن کو وہ دیوی کے روپ میں یوں پیش کرتے ہیں۔

شبہ صورت وہ عجب تھی وہ عجب شبہ تھی لگن — کہ جب آکاش سے اترا تھا ترا سنگھاسن
اک چکا چوند کا عالم دمِ نظارہ تھا — گورا گورا تن نازک تھا سراپا کندن
تھی چمک آہ ترے چاند سے رخساروں کی — کسی مندر میں تھے یا گھی کے دیئے دو روشن

ان کی نظم میں اردو کے ساتھ ساتھ ہندی کے سہل اور عام فہم الفاظ کا خوبصورت امتزاج ہے۔ نظمیں دینی اور دیگر موضوعات پر کہی ہیں۔

ان کی مشہور نظم "بیر بہوٹی" کیٹس کی مشہور نظم "اینگیبل" کے انداز پر کہی گئی ہے جس میں انہوں نے ایشیائی شاعری کی خوبیاں سمو دینے کی کوشش کی ہے۔ اس نظم میں جناب سرور نے تشبیہات اور استعارات کے ساتھ ساتھ اپنے منفرد لہجہ میں فن شاعری کے جوہر دکھائے ہیں۔

آہ! او ننھے سے کیڑے نازشِ صحرا ہے تو — شعلہ زارِ حسن کی چھوٹی سی اک دنیا ہے تو
کچھ عجب عالم ہے تیرے حسن کے انداز کا — سرخ ڈولا ہے کسی چشمِ فسوں پرواز کا
گل بداماں ہے شفق میں شعلۂ تنویرِ حسن — خونِ عاشق ہے زمیں پر یا گریباں گیرِ حسن
جلوۂ گل ہے فضائے وادیِ پرخار میں — سرخ نکتہ ہے قبائے سبزہ کہسار میں

سرور صاحب نے رام چندر جی کے بن باس کے وقت کی گریہ وزاری کا جو منظر اپنی نظم "سیتا جی کی گریہ وزاری" میں پیش کیا ہے وہ بھی قابلِ قدر ہے۔

ہمراہ اپنے ناتھ مجھے ساتھ لے چلو — ریکھا تمہارے چرنوں کی ہوں ساتھ لے چلو
نازک ہے میرا شیشۂ دل ٹوٹ جائے گا — چھوٹا تمہارا ساتھ تو جی چھوٹ جائے گا
قسمت نے جب سے باپ کے گھر سے کیا جدا — سوامی مجھے نظر سے نہ تم نے کیا جدا

گھر میں جو چھوڑ جاؤ گے سیتا غریب کو — پاؤ گے بن سے آ کے نہ سیتا غریب کو

تا ایک تم بغیر ہے عالم مرے لئے — فردوس بھی ہے آہ! جہنم مرے لئے

سرور کی آخری نظم "ترانۂ وحدت" مئے وحدت کا ایک چھلکتا جام ہے جو خمخانہ سرور کو تب و تاب بخشتا ہے اور اس کے حسن کو جلوہ گر کرتا ہے۔

دل میں آنکھوں میں ترے حسن کی ہے جلوہ گری — وہ شیشے ہیں کہ جن میں مئے وحدت ہے بھری

دین و دنیا کا رہا ہوش نہ میخواروں کو — تیری آنکھوں نے پلائی وہ مئے بیخبری

سرور نے مختلف موضوعات پر نظمیں کہی ہیں۔ ان نظموں میں سرزمین وطن، خاک وطن، بچہ اور ملائی، فضائے برشگال، ایک حسینہ اور جگنو، بے ثباتی دنیا، گنگا جمنا، پریاگ کا سنگم، بیر بہوٹی، پدمنی، حسرت دیدار، امید طفلی، بچپن کی یاد، عسرت شباب، یاران عدم، ماتم آرزو، گل فردوس، لکشمی جی، سیتا جی کی آہ و زاری، پھولوں کا گنج زیادہ مقبول عام ہوئیں۔

سرور کا بیشتر کلام ماہنامہ ادیب فیروز آباد۔ پروانہ میرٹھ۔ اردوئے معلیٰ علی گڈھ۔ زمانہ کانپور۔ مخزن لاہور۔ شمس بنگالہ کلکتہ۔ تنویر المشرق کلکتہ۔ آزاد لاہور اور ادیب الٰہ آباد وغیرہ رسائل میں برابر شائع ہوتا رہا۔

سرور کا کمال یہ ہے کہ وہ ماں یا دیوی کے تصور کی توضیح کرتے ہیں اور اس مقدس تصور میں محبوبیت کی پوری شان پیدا کرتے ہیں۔

عورت کے کئی روپ ہیں قدیم آریائی ذہن نے اس کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے۔ کبھی وہ ماں بن کر نمودار ہوتی ہے کبھی بہن کی صورت اختیار کرتی ہے اور کبھی عورت یا بیٹی کی شکل میں اور کبھی ایک ہی عورت کے یہ تمام روپ ہوتے ہیں۔ ان سب کی طرح طرح سے تقدیس کی گئی ہے

سرور کے ہاں بلبل و قمری کے پہلو بہ پہلو پپیہا، ہنس اور کوئل گاتی سنائی دیتی ہے، شمع اور پروانے کے ساتھ ساتھ جگنو اور بھنورے جلوہ افروز ہیں۔ سنبل و ریحان اور یاسمین و یاسمن کے ساتھ ساتھ کیتکی، چمپا موتیا اور کنول اپنی مشک اور مشام حیات کو معطر کرتے ہیں۔

سرور کی شاعری میں غم و اندوہ اور آہ و گریہ ہے اس کی وجہ ان کے اکلوتے سات سالہ بیٹے کی ان سے دائمی مفارقت تھی۔ اس کے سانحۂ ارتحال نے ان کے چین و راحت کو ان سے ہمیشہ کے لئے چھین لیا تھا۔ ان کو بے حس و حرماں اور تنہا کر دیا تھا۔ اب وہ دار فانی کی کسی بھی شئے کی کوئی بھی پروا نہیں کرتے تھے۔ ایام تنہائی و بے کسی میں شاعری ہی ان کی مونس و رفیق تھی۔

شاعری کے ساتھ ساتھ کمبخت شراب بھی غم غلط کرنے کو ان کی مصاحب ہو گئی اور رفتہ رفتہ ان کی زندگی میں ایسا رچ بس گئی کہ اپنے ساتھ ان کو بھی لے گئی۔ سرور ذات الجنب میں مبتلا ہو گئے اور بالآخر ۳ر دسمبر ۱۹۱۱ء[1] کو صرف ۳۷ سال کی عمر میں وہ اپنے بھائی منشی مصری لال کے پاس مقیم تھے یہیں راہی ملک بقا ہو گئے۔

ایام بیماری میں ایک دن جب انہوں نے شراب مانگی تو شراب کے بجائے جب پانی کا گلاس دیا گیا تو فرمایا۔

سمجھ لیا مرے ساقی نے بدحواس مجھے — بجائے مئے دیا پانی کا اک گلاس مجھے

آہ سرور سا آسمان اردو کا مہر درخشاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا اور ایک گوہر نایاب، لعل درخشاں کو دستبرد زمانہ نے ہم سے چھین لیا۔ سرور نہیں گئے سوز و گداز، عبرت و حسرت عرفان و وحدت، فہم و فراست، افسون و فسانہ، ادب و سخن کی مجلسوں اور ہنگامہ آرائیوں کو درہم برہم کر گئے۔ آہ!

نہ نقش پائے عزیزاں، نہ بانگ کوس رحیل — یہ کب کدھر کو گیا کارواں نہیں معلوم

[1] ڈاکٹر حکم چند نیر نے ۳۰ر دسمبر ۱۹۱۰ء وفات کی تاریخ لکھی ہے (مقدمہ نوائے سرور، ص ۱۱) جو ۳۷ سال عمر کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتی ہے (معارف)

رامپور کے قدیم عربی مدارس

از
جناب محمد شاکراللہ خانصاحب خدابخش لائبریری پٹنہ

۲

مدرسہ عزیزیہ یہ مدرسہ ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء میں مسجد زینہ عنایت خاں میں قائم کیاگیا۔ اس کے بانی محمد شاہ محدث (م ۱۹۱۹ء) تھے جو شاہ عالم علی مرادآبادی اور اپنے والد ماجد سید محمد حسن شاہ محدث (م ۱۳۱۲ھ) کے شاگرد رشید تھے۔ میاں محمد حسن شاہ رامپور کے محدثین کے مشہور خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس خاندان کا سلسلہ حدیث میں شاہ عبدالعزیز رحمہ صاحب تک پہنچتا ہے۔ اس لئے انہیں کے نام نامی پر اس مدرسہ کو قائم کیا گیا۔[1]

والیٔ رامپور نواب حامد علی خاں (م ۱۹۳۰ء) کی توجہ سے جب اس کی عمارت تعمیر ہو گئی تو اسے مسجد سے مدرسہ میں منتقل کردیا گیا۔ اس مدرسہ میں عربی و فارسی کی انتہائی تعلیم دورۂ حدیث تک ہوتی تھی اس کے پہلے منتظم میاں محمد شاہ تھے۔ ان کے بعد ان کے فرزند سعید میاں محمد حامد شاہ اس کے منتظم ہوئے ۱۹۳۶ء میں حامد شاہ صاحب کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے میاں احمد شاہ منتظم ہو گئے۔ احمد شاہ صاحب ۵ راگست ۱۹۸۰ء کو انتقال کر گئے تب سے اسکے نگراں میاں احمد شاہ کے بھائی میاں محمود شاہ ہیں۔

مدرسہ کی موجودہ حالت افسوسناک ہے، میاں احمد شاہ مرحوم کی جائداد کی تقسیم عمل میں آئی تو مدرسہ بھی دو حصوں میں بٹ گیا۔ ایک حصہ میاں محمود شاہ کے قبضہ میں آگیا جو مدرسہ کی حیثیت سے بالکل ختم ہو چکا ہے۔ دوسرا حصہ میاں احمد شاہ مرحوم کی بیوہ کے حصہ میں آیا جس کے نگراں احمد شاہ کے خویش سید مرتضیٰ علی فرحت ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ بیوۂ سید احمد شاہ نے اپنے حصہ میں قرآن پاک کی تعلیم کے لئے ۱۶ رمارچ ۱۹۸۵ء کو مولانا وجیہ الدین احمد خاں[2] سے مدرسہ کو دوبارہ شروع کرایا جس میں ایک حافظ بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دیتے ہیں۔ خدا کرے یہ سلسلہ جاری رہے اور مدرسہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے۔

---

[1] ماہنامہ معارف اعظم گڈھ ماہ فروری ۱۹۸۰ء ص ۱۳۳

مدرسہ اصلاح قوم یہ مدرسہ انجمن اصلاح قوم پنجابیان کی جانب سے ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۱ء میں قائم ہوا تھا۔ شروع میں اس کو مدرسۂ پنجابیان بھی کہا جاتا تھا ابتدا میں حفظ و ناظرہ کی تعلیم دی جاتی تھی ۱۹۲۶ء میں حاجی غلام حضرت صاحب کی تحریک پر اس میں عربی شعبہ کا اضافہ ہوا اور مولانا وجیہ الدین احمد خاں مولوی عبدالوہاب خاں اور مولوی سید محمد یوسف مدراسی مدرس عربی مقرر ہوئے حاجی غلام حضرت صاحب قوم پنجابی کے صاحبِ ثروت اور مخیر فرد تھے انھوں نے اپنی ذاتی رقم سے کتب عربی خریدیں اور مدرسہ کے لیے وقف کیں۔ اس مدرسہ کے علاوہ انھوں نے مدرسہ انوارالعلوم اور مطلع العلوم کے لیے بھی کافی کتب وقف کیں۔

۱۹۲۸ء میں مولانا وجیہ الدین احمد خاں سلہٹ تشریف لے گئے اور صرف مولوی عبدالوہاب خاں مدرس عربی رہ گئے کچھ عرصہ کے بعد مولوی محمد علی لطفی علی گڈھی یہاں مدرس ہو کر آئے۔ حاجی غلام حضرت کا انتقال ۱۹۳۲ء میں ہوا جس کے بعد ان کے وقف میں کچھ تنازعہ پیدا ہوا اور عربی شعبہ ختم ہو گیا۔ البتہ حفظ و تجوید کا سلسلہ قائم رہا۔ مدرسہ کی موجودہ کیفیت اس طرح ہے۔
(۱) اصلاح قوم جونیر ہائی اسکول (۲) شمسی گرلز جونیر ہائی اسکول (۳) K.G سیکشن (۴) درجۂ حفظ و ناظرہ۔

مدرسہ کی ایک شاخ مسجد واحد نور صاحب واقع خسرو باغ روڈ میں قائم ہے اس کا نام تعلیم القرآن ہے اس شاخ میں حفظ و تجوید کے ساتھ ناظرہ کی تعلیم دی جاتی ہے انجمن کی اپنی پختہ عمارت ہے اس کے علاوہ برابر کے ایک مکان میں جو کہ وقف شدہ تھا نئی عمارت تعمیر ہو گئی ہے انجمن کی سالانہ رپورٹ کے علاوہ وقتاً فوقتاً بعض اصلاحی رسالے بھی شایع ہوتے رہتے ہیں۔[1]

مدرسہ مطلع العلوم یہ مدرسہ ۱۹۱۳ء میں مسجد گھیر مردان خاں میں قائم ہوا۔ اس کے بانی مولوی

---

[1] اس مدرسہ کے متعلق اکثر معلومات سماعی اور مدرسہ کی گذشتہ روداد سے ماخوذ ہیں۔

خلیل اللہ پشاوری تھے ان کی تعلیم پہلے مدرسہ ارشادیہ میں ہوئی پھر مدرسہ عالیہ سے فراغت کی سند لی۔ وہ پشاور کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۹۷ء کے لگ بھگ رام پور تشریف لائے تھے اور مسجد بذریہ ہمت خاں میں قیام کیا تھا۔[1] تکمیل علوم کے بعد انھوں نے تدریس شروع کر دی ۱۹۱۸ء میں قریشی برادری کے ایک مخیر شخص منشی محمد عبداللہ نے مسجد کے سامنے ایک چہار رویہ شاندار عمارت تعمیر کرا دی اور اسے مدرسہ کے لیے وقف کر دیا۔[2] اس دور میں رام پور کے مدارس میں سب سے شاندار عمارت اسی مدرسہ کی تھی۔

مولوی خلیل اللہ صاحب تا حیات اس مدرسہ کے مہتمم رہے ۱۹۴۲ء میں ان کی وفات کے بعد مولوی سید احمد ہزاروی اس کے مہتمم بنائے گئے سید احمد صاحب کے بعد امجد علی خاں اس کے مہتمم ہوئے جب وہ پاکستان چلے گئے تو مولوی غلام محی الدین اس کے اہتمام کے ذمہ دار قرار پائے۔ ۱۹۶۴ء میں ان کا بھی انتقال ہو گیا تب اس کے مہتمم مولوی صغیر احمد مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۴ء میں وہ بھی فوت ہو گئے اور ان کے بعد اب سعید ظفر قریشی اس کے مہتمم ہیں۔

۸۴-۱۹۸۰ء کے درمیان اس مدرسہ میں کافی تعمیرات ہوئیں مدرسہ کے سامنے ایک دو منزلہ عمارت بنائی گئی ہے۔ نچلی منزل میں دو کانیں ہیں جو کرایہ پر دیدی گئی ہیں[3] اوپری منزل میں بیسک سیکشن قائم ہے۔

مدرسہ میں درس نظامی اور دورۂ حدیث کی تعلیم ہوتی ہے بورڈ الٰہ آباد کے امتحانات بھی دلائے جاتے ہیں جامعہ اردو علی گڑھ سے منظور شدہ امتحانی سینٹر بھی یہاں قائم ہے حفظ و ناظرہ کی تعلیم بھی جاری ہے۔ سالانہ آمد و خرچ ڈیڑھ لاکھ روپے کے قریب ہے۔ سال

---

[1] دبدبۂ سکندری مورخہ ۲۳ مئی ۱۹۴۲ء [2] روئداد مدرسہ مطلع العلوم رام پور بابتہ ۱۳۴۱ھ [3] رپورٹ مدرسہ مطلع العلوم رامپور بابتہ ۱۹۸۴ء۔

۱۹۸۵ء سے دارالاقامہ کا قیام عمل میں آگیا ہے جس میں پچاس طلبہ مقیم ہیں۔

اس مدرسہ کی سند کو جامعۂ ازہر (قاہرہ) سے منظوری بھی حاصل ہے اس لیے انڈونیشیا اور ملایشیا کے طلبہ بھی یہاں تعلیم کے لیے آتے ہیں اور سند لے کر جامعۂ ازہر میں داخلہ لیتے ہیں۔

مدرسہ کی سالانہ رپورٹ ابتدا ہی سے شایع کی جاتی ہے اور اس کے انتظام و انصرام کی ذمہ دار ایک کمیٹی ہے جس کے صدر جناب سعید ظفر ہیں جن کے عزائم اور حوصلے بلند ہیں۔ مدرسہ کے فارغ التحصیل اشخاص میں مندرجہ ذیل نام قابل ذکر ہیں۔

(۱) مولوی امتیاز علی خاں عرشی مرحوم سابق ڈائرکٹر رضا لائبریری رام پور (۲) مولوی سید محمد جمیل سابق فائنانس سکریٹری رام پور (۳) مولوی شیخ فرید الدین وکیل مرحوم عرف اچھے میاں (۴) مولوی امجد علی خاں سابق مہتمم مدرسہ ہذا (۵) مولوی صغیر احمد مرحوم سابق مہتمم مدرسہ ہذا۔

ابتدا سے اب تک مدرسہ کے شعبۂ عربی سے تیئیس[1] اور شعبۂ اردو فارسی سے چھ اساتذہ وابستہ رہے ہیں جن کے نام تنخواہ کے رجسٹر سے معلوم کیے جا سکتے ہیں۔

جامعۃ المعارف

یہ مدرسہ جنوری ۱۹۳۴ء میں مولوی عبدالوہاب خاں نے قائم کیا تھا اور محلہ روڈ پر مسجد فدایار خاں کے قریب ایک مکان میں جو کرایہ پر لیا گیا تھا اسباق ہوتے تھے۔[1]

ابتدا میں جگہ کی تنگی کی وجہ سے تعلیم مسجد میں ہوتی تھی مگر جناب دولہ خاں و بنے خاں مستاجران نے اس مکان کو خرید کر مدرسہ کے لیے وقف کر دیا۔[2] اللہ ان کی مغفرت فرمائے ۱۹۴۲ء میں اس کی مستقل عمارت وجود میں آگئی جس کی وجہ سے تعلیم و تعلم میں بہت آسانی ہو گئی۔

مولوی عبدالوہاب خاں رامپور کے سرگرم سیاسی کارکن تھے رام پور میں کانگریس کا قیام انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مشغولیت کی وجہ سے مولانا مدرسہ کی طرف کم توجہ دے پاتے تھے[3] ۲۲ نومبر ۱۹۷۸ء کو

---

[1] روداد مدرسہ جامعۃ المعارف مرتبہ عبدالوہاب خاں رام پوری بابتہ ۱۹۳۴ء [2] ایضاً ۱۹۴۱-۴۲ء [3] ایضاً ۱۹۴۷ء

ان کی وفات کے بعد کارہائے تولیت ان کے چھوٹے بھائی مولانا عبدالسلام خاں سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ انجام دینے لگے

اس مدرسہ کی روداد ۱۹۳۵ء سے چھپتی ہے اور مولانا عبدالوہاب خاں کے انتقال سے قبل تک چھپتی رہی ہے اب کچھ عرصہ سے یہ سلسلہ بند ہے۔ مطبوعات میں تفسیر تقریب القرآن (سورہ فاتحہ و بقرہ) از مولانا عبدالوہاب خاں ۱۹۶۷ء میں طبع ہوئی تھی لیکن افسوس ہے کہ یہ پوری طبع نہ ہو سکی حالانکہ مکمل مسودہ موجود ہے۔

مدرسہ کے چند ممتاز فارغ التحصیل علماء کے نام درج ذیل ہیں۔

(۱) مولوی ثناء اللہ خاں سابق مدرس مدرسہ عالیہ رامپور (۲) مولوی عزیز اللہ خاں سابق مدرس مدرسہ عالیہ رام پور (۳) مولوی عبدالقدیر خاں سابق مدرس مدرسہ عالیہ رام پور (۴) مولوی زبیر احمد شمسی ناظم مدرسہ فیض العلوم رام پور (۵) مولوی حکیم محمد حسین خاں شفا اسسٹنٹ لائبریرین رضا لائبریری رام پور۔

مولوی عبدالوہاب خاں مرحوم کی حیات تک حدیث کی سند بھی دی جاتی تھی۔ مدرسہ کے شعبۂ عربی سے بائیس[۲۲]، شعبۂ اردو فارسی سے چھ[۶] اور شعبۂ حفظ و ناظرہ سے چار[۴] اساتذہ وابستہ رہے ہیں[۱]۔

مدرسہ رفعت القرآن | یہ مدرسہ "۲۱ ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۶ء" کو خانقاہ صابریہ فاروقیہ محلہ بنگلہ آزاد خاں میں قائم ہوا[۲]۔ اس کے بانی محمد فضل حسن خاں صابری مدیر دبدبۂ سکندری رام پور (م ۱۹۷۰ء) تھے۔ مدرسہ عربی و فارسی اور حفظ و ناظرہ کی تعلیم کے لیے اچھی شہرت رکھتا تھا مگر شاہ فضل حسن کے انتقال کے بعد ختم ہو گیا اب ان کے داماد حبیب شاہ خاں نے ۱۹۸۳ء سے اس میں دوبارہ حفظ قرآن

---

[۱] نوٹ: اساتذہ کے نام مختلف برسوں کی روداد سے لیے گئے ہیں [۲] دبدبۂ سکندری مورخہ ۲ مارچ ۱۹۳۹ء

اور ناظرہ کی تعلیم کا انتظام کیا ہے خدا کرے ان کی کوششیں بار آور ہوں اور مدرسہ کو از سر نو زندگی ملے

منبع العلوم | یہ مدرسہ یکم اگست ۱۹۴۲ء / ۱۳۶۱ھ کو مسجد گھیر نجو خاں میں قائم ہوا۔ اس کے بانی مولوی محمد عابد شاہ (داماد مولانا خلیل اللہ) سکنہ پیلا تالاب تھے[۱]۔ اس کے قیام کی تقریب کا باعث یہ ہوا کہ مولوی خلیل اللہؒ کے انتقال کے بعد ان کے داماد مولوی عابد شاہ کو مدرسہ مطلع العلوم کا مہتمم نہیں بنایا جا سکا جس سے کبیدہ خاطر ہو کر مولوی صاحب موصوف نے یہ مدرسہ قائم کیا۔

اس میں عربی و فارسی کی تعلیم کا معیار اچھا تھا اور خود مولوی عابد شاہ اور مولوی عبدالجبار خاں درس دیتے تھے۔ مولوی عبدالجبار خاں مولوی عبدالغفار خاں مرحوم کے صاحبزادہ تھے ان کا درس بہت موثر اور دل نشیں ہوتا تھا ان کے درس میں بکثرت طلبہ شریک ہوتے تھے۔

۱۹۵۰ء کے قریب مولوی عابد شاہ مہتمم مشرقی پاکستان تشریف لے گئے اور مدرسہ ختم ہو گیا۔

جامع العلوم فرقانیہ | انڈین یونین سے ریاست رام پور کا انضمام "یکم جولائی ۱۹۴۹ء کو ہوا[۲]۔ جس کے بعد رام پور کے اکثر محکمہ جات اور اداروں میں تنزل شروع ہوا۔ اس کا اثر تعلیم کے شعبہ پر بھی پڑا۔ چنانچہ مدرسہ عالیہ جو ۱۷۷۴ء میں نواب فیض اللہ خاں (م ۱۷۹۴ء) نے قائم کیا تھا، روبہ زوال ہونے لگا اور تعلیمی حالت گرنے لگی۔ ادھر مدرسہ ارشاد العلوم جو ساٹھ سال سے تعلیم کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دے رہا تھا بند ہو چکا تھا، مدرسہ منبع العلوم ختم ہو چکا تھا۔ مدرسہ مطلع العلوم اور مدرسہ انوار العلوم کی بھی تعلیمی ساکھ برقرار نہیں تھی۔

اس زمانہ میں مولانا شاہ وجیہ الدین احمد خاں نے علمی انحطاط کو روکنے کے لیے جد و جہد شروع کی جس میں ان کو بڑی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر انھوں نے ۱۹۵۰ء / ۱۳۶۹ھ میں

---

[۱] دبدبۂ سکندری مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۴۲ء [۲] فرمانروایان رام پور مرتبہ حکیم محمد حسین خاں شفا کیٹلاگر رضا لائبریری رام پور۔ ناظم پریس رام پور ۱۹۷۲ء صفحہ ۱۳۳ (ش)

اپنے بزرگوں کی آرام گاہ خانقاہ احمدیہ بازار نشن گنج میں ایک مکتب مدرسۂ فرقانیہ کی نبیاد ڈالی[1] جس میں حفظ و ناظرہ کے ساتھ ابتدائی عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم ہوتی تھی، رفتہ رفتہ اس مدرسہ میں عربی و فارسی کی مکمل تعلیم بھی ہونے لگی۔ اور مدرسہ کا نام جامع العلوم فرقانیہ کر دیا گیا[2]

اس کے بعد تعمیرات کا سلسلہ شروع ہوا۔ مدرسہ کے پاس زمین کافی تھی۔ شہر اور بیرون شہر کے صاحب ثروت حضرات کے تعاون سے چند برسوں میں ایک دو منزلہ شاندار و وسیع عمارت تیار ہو گئی اور مدرسہ کے نظم و نسق کو چلانے کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل بھی عمل میں آئی۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں جامع العلوم فرقانیہ کے نام سے ایک کتب خانہ قائم ہوا جو اس وقت شہر کے بڑے کتبخانوں میں شمار ہوتا ہے اس میں کتابوں کی تعداد اس طور پر ہے

مطبوعات		مخطوطات	
اردو	۳۶۰۷	فارسی	۱۰۱
عربی	۲۶۵۳	اردو	۷۰
فارسی	۱۱۶۶	عربی	۴۴
ہندی	۱۰۹	پشتو	۷
انگریزی	۶۰	ہندی	۲
سنسکرت	۱۶		——
پشتو	۸	میزان :-	۲۲۴
میزان	۷۶۱۹	غیر مندرج کتب	۱۴۰۰

[1] و [2] مادر علمی۔ جامع العلوم فرقانیہ رام پور از مولوی محمد یوسف شمسی مشمولہ ضیاء دجیہ شمارہ ۴ ۱۹۸۴ء

کتب خانہ کو کئی بیش قیمت ذخیرے (collections) بھی برابر حاصل ہو رہے ہیں اب تک کے دستیاب ذخیروں کی فہرست یہ ہے۔

(۱) کتب خانہ مولوی سلامت اللہ رام پوری (۲) کتب خانہ مولوی حافظ وزیر احمد ادیب۔ (۳) کتب خانہ مولوی عبدالواحد خاں رام پوری ثم کلکتوی (۴) کتب خانہ میاں خواجہ احمد رامپوری (۵) کتب خانہ وجیہ (بانی ادارہ) (۶) ذخیرۂ ولایت حسین خاں آثم رام پوری (۷) ذخیرہ مولوی منظور المحمود خاں رام پوری (۸) سعید پبلک لائبریری سرائے کلاں رام پور (۹) کتب خانہ مدرسہ انوار العلوم رام پور (۱۰) ذخیرہ خلیل اللہ صاحب میلاد خواں ساکن زنیہ عنایت خاں رام پور

کتب خانہ کو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے اور حکومت ہند کی جانب سے فارسی کے دو اسکالر ریسرچ کر چکے ہیں۔

مدرسہ میں دارالافتا اور دارالقضا کے شعبے بھی ہیں موخر الذکر میں مظلوم عورتوں کے مسائل مثلاً طلاق، خلع نان نفقہ وغیرہ کو حل کر کے انھیں انصاف دلایا جاتا ہے

مدرسہ میں طلبہ کو تقریر و تحریر کی مشق کرانے کا انتظام بھی ہے طلبہ کی انجمن سالانہ میگزین شایع کرتی ہے جس کے اب تک چھ شمارے نکل چکے ہیں اس کے مکتبہ سے وقتاً فوقتاً مختلف کتب و رسائل بھی شایع ہوتے ہیں۔

مدرسہ کی مندرجہ ذیل تین شاخیں ہیں جن میں ابتدائی تعلیم ہوتی ہے۔

(۱) مدرسہ درس القرآن محلہ کٹرہ رام پور (۲) فرقانیہ اسکول محلہ نالہ پار رام پور (۳) مدرسہ انوار العلوم بازار کلاں رام پور۔

اس وقت رام پور شہر کا سب سے بڑا مدرسہ یہی ہے جس میں تقریباً ۵۰۰ طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اس کے اساتذہ کی تعداد ۲۰ ہے۔ ۶۰ طلبہ بورڈنگ میں مقیم ہیں جن کے

قیام وطعام کا انتظام مدرسہ کرتا ہے۔ بورڈ (الہ آباد) کے تمام امتحانات دلائے جانے کا بندوبست ہے۔ جزوی طور پر جامعہ اردو (علی گڑھ) اور ہائی اسکول انگلش (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے امتحانات کی تیاری بھی کرائی جاتی ہے۔

مدرسہ دارالعلوم گلشن بغداد یہ ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۷ء میں قائم ہوا تھا اس میں آٹھویں درجہ تک کی تعلیم کے علاوہ حفظ وناظرہ اور تجوید کا بھی انتظام ہے اور الہ آباد بورڈ کے امتحانات بھی دلائے جاتے ہیں، مدرسہ کے مصارف منشی عبدالمجید صاحب قریشی مرحوم بانی مدرسہ کی موقوفہ جائداد سے پورے کیے جاتے ہیں۔ حال میں رام پور میں بعض نئے مدرسے بھی قائم ہوئے ہیں۔ خدا کرے یوں ہی چراغ سے چراغ جلتا رہے اور رام پور کی علمی ودینی مرکزیت بھی باقی رہے۔

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں

ہندوستان کی قدیم تاریخ کی کتابوں میں مرتب طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی حالات اور ان کے مدرسوں اور تعلیم گاہوں کا حال نہیں ملتا، حالانکہ اسلامی ہند کے مدارس کی تاریخ ایک مستقل توجہ کی طالب تھی، مولانا سید سلیمان ندویؒ یہ تاریخ خود مرتب کرنا چاہتے تھے لیکن پھر ان کے اشارہ اور مشورہ سے مولوی ابوالحسنات ندوی مرحوم نے نہایت تلاش وتحقیق کے بعد ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہوں پر ایک مقالہ لکھا اور مدارس اجمیر ودہلی وپنجاب بنگال ودکن، کشمیر وگجرات وغیرہ کے علاوہ بدایوں، روہیل کھنڈ، رامپور، جونپور اور دوسرے مشہور شہروں اور قصبات کے مدارس کے احوال تفصیل سے لکھے، اہلِ نظر نے اس مقالہ کو بے حد پسند کیا۔ دارالمصنفین نے اسی مقالہ کو کتابی صورت میں شایع کیا ہے۔

مرتبہ:- مولوی ابوالحسنات ندوی مرحوم سابق رفیق دارالمصنفین،

قیمت:- ۱۵ روپیے

منیجر

اخبارِ علمیہ

ہندوستان وپاکستان میں مسلم صحافت کی اصل زبان اردو رہی ہے، ضرورت کے باوجود دوسری زبانوں اور خاص طور سے انگریزی میں اسلامی رسائل وجرائد کی تعداد بہت کم ہے، اب ادھر کئی نئے رسالے نظر سے گزرے جو انگریزی زبان میں اسلامی عقائد ونظریات کی ترجمانی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، ان میں بنگلور کا ماہنامہ "اسلامک وائس" نامی جریدہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جو اپنے لائق مدیر جناب اے ڈبلو۔ سعادت اللہ صاحب کی نگرانی میں پابندی سے شائع ہو رہا ہے اس میں قرآن، حدیث، فقہ، تعلیم قرآن وغیرہ کے مخصوص کالموں کے علاوہ دوسرے مفید ودلچسپ مضامین، تبصرے اور خبریں ہوتی ہیں۔ اور اب پاکستان میں کراچی کی جامعہ فاروقیہ سے ایک ماہنامہ "الفاروق انٹرنیشنل" کے نام سے شائع ہو رہا ہے، اس میں بھی قرآن وحدیث، سیرت وسوانح وغیرہ کے مستقل کالم ہیں۔ اس میں جدید اسلامی موضوعات پر بھی اچھی تحریریں شائع ہوتی ہیں۔ اداریہ اور رسالہ کا آخری کالم AT LAST خاص طور پر لائق مطالعہ ہوتا ہے، تازہ شمارہ میں ڈاکٹر سید عبداللطیف مرحوم، ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی اور رئیس الدین خاں شیرانی کے مضامین ہیں، اس کے مدیر جناب سید محمد ادریس ہیں۔ یہ دونوں رسالے حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔

گزشتہ معارف میں ہم نے ترکی کے ایک ادارہ (IRICICA) کا ذکر کیا تھا، اس ادارہ نے کئی عمدہ کتابیں شائع کی ہیں مثلاً ایک کتاب WORLDBIBLOGRAPHY OF TRANSLATIONS OF THE - MEANING OF THE HOLY QURAN کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ یہ قرآن مجید کے غیر مطبوعہ ترجموں کے علاوہ مختلف ملکوں سے ۱۵۱۵ء سے ۱۹۸۰ء تک شائع ہونے والے تراجم قرآنی کی ایک فہرست ہے، فہرست نگار نے ۶۵ زبانوں کے ۲۶۷۲ ترجموں کا ذکر کیا ہے، جن میں ۵۵۱ مکمل اور ۸۸۳ نامکمل ترجموں کا تعارف بھی کرایا ہے، کتاب کے مرتب جناب اکمال الدین احسان اوغلو اور مدونین عصمت بینارک اور حالت ایرن HALIT -

EREN ہیں۔ مرتب نے مقدمہ میں اسلام کے عہد آغاز سے موجودہ زمانہ تک کے قرآنی تراجم کی اجمالی تاریخ بھی لکھی ہے۔ قیمت ۸۰ ڈالر ہے۔ اسی ادارہ کی ایک اور کتاب CATALOGUE OF ISLAMIC MEDICAL MANU SCRIPTS IN THE LIBRARIES OF TURKY بھی قابل ذکر ہے، اس میں ترکی کے ۱۲۹ اہم کتب خانوں کے تقریباً ایک ہزار طبی مخطوطات کا تعارف کرایا گیا ہے۔ استنبول میں ۱۹۸۴ء میں اسلامی طب پر ایک کانفرنس ہوئی تھی۔ یہ کیٹلاگ اسی موقع پر شائع کیا گیا تھا۔ اس کے مرتب بھی اکمال الدین احسان اوغلو ہیں، اور ڈاکٹر رمضان سیسین، سیمیل اکسینار اور جاوید ازگی مدونین ہیں۔ ایک اور کتاب — INTER NATIONAL DIRECTORY OF ISLAMICCULTURAL INSTITUTIONS بھی اپنے موضوع کے لحاظ سے اہم ہے، اس میں ۹۰ ملکوں کے ۳۵۷۹ ایسے اداروں کا تعارف ہے جو اسلامی تاریخ اسلامی تہذیب و ثقافت اور اسلامی علوم و فنون کی خدمت میں مصروف ہیں۔ ادارہ کی بعض اہم مطبوعات کا ذکر آئندہ بھی ان صفحات میں کیا جائیگا۔

یورپ کے مرد بیمار اور ماضی میں اسلام کی عظمت و شوکت کے علمبردار، ترکی میں احیائے اسلام کی موجودہ کوششوں سے ہمارا قومی پریس غافل نہیں ہے، گاڈفرے جینسن مشہور صحافی ہیں انہوں نے اپنی کتاب MILITANT ISLAM کی بدولت بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ حال ہی میں ٹائمز آف انڈیا کے سنڈے ریویو میں ان کا ایک مضمون TALE OF TWO CULTURES شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے ترکی کے ماضی اور حال کا جائزہ لے کر مصطفی کمال پاشا کے سیکولرزم سے اسلامیت کی کشمکش دکھائی ہے، سیکولرزم کے فروغ کی ہر ممکن کوشش کے باوجود انہیں اسلام کی سخت جانی اور ثابت قدمی کا اعتراف ہے، ان کے خیال میں ترکی کے انتخابات میں راسخ العقیدہ مسلمان جماعتوں کے کامیاب نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی جماعتیں، اسلامی ریاست کے قیام پر زیادہ زور نہیں دیتیں، سیاست و حکومت کے بجائے ان کی اصل توجہ معاشرتی اور تہذیبی اصلاح کی جانب مرکوز رہتی ہے جس سے اسلامی رجحانات کو زیادہ قوت و توانائی مل رہی ہے۔

اسلام اور دوسرے مذاہب و نظریات پر ایک دلچسپ کتاب THEWORLD'S RELIGIONS

NINIAN SMART کے نام سے کیمبرج یونیورسٹی پریس سے شائع ہوئی ہے، اس کے مصنف نی نین اسمارٹ تقابل ادیان کے موضوع پر سند کی حیثیت رکھتے ہیں جو لنکاسٹر یونیورسٹی میں پروفیسر بھی رہ چکے ہیں۔ کتاب میں مختلف مذاہب کے سات بنیادی پہلوؤں اعتقادی، عملی، روحانی، افسانوی و دیومالائی، اخلاقیات، خارجی و مادی مظاہر پر بحث کی گئی ہے، مصنف کا رجحان فلسفہ وحدت ادیان کی جانب ہے، ایک اقتباس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے، لکھتے ہیں کہ "لوگ مختلف راستوں پر گامزن ہیں، اس لئے دنیا کو اپنی اپنی نظر سے دیکھتے ہیں، ہر فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ حق و صداقت اسی کے پاس ہے، اس اختلاف کے باوجود ہم سب سے استفادہ کر سکتے ہیں، مارکسزم کا سماجی انصاف، لبرل کی انسانی حریت، خدا اور اس کے بندوں سے محبت کا مسیحی دعویٰ، اسلام کا جذبۂ اخوت، بدھوں کا فلسفہ امن اور باطنیت، ہندوؤں کی ریاضت اور . . . . . تاؤازم کی فطرت سے قربت، کنفیوشس کی بنی نوع انسان سے رواداری، افریقہ میں زندگی کی تقدیس، یہودیت کا یہ اصول کہ مصائب کو برداشت کرنے کے بعد ہی زندگی میں معنویت آتی ہے، سکھوں کی عزتِ نفس اور دوسرے بہت سے روحانی اصول باہم متضاد و متباین نہیں ہیں، اگر ایک عالمی مذہب کی تشکیل مشکل ہے تو ایک آفاقی تہذیب کی یافت تو بہرحال ممکن ہے" بقول خوشونت سنگھ یہ کتاب ایک انسائیکلوپیڈیا ہے، جس کا مطالعہ کم از کم تمام یونیورسٹیوں کے طلبہ کے لیے لازمی قرار دینا چاہیئے۔ کتاب میں خوبصورت تصاویر، ضروری الفاظ کا لغت اور تمام مذاہب کے عقائد کا خلاصہ بھی سلیقہ سے پیش کیا گیا ہے۔ قیمت ۲۵ پونڈ ہے۔

دفینوں کے ملنے کی جو خبریں آتی رہتی ہیں، ان میں کتابوں کے خزینے بھی شامل ہیں۔ ہندوستان کے امریکی سفارت خانہ سے شائع ہونے والے SPAN سے معلوم ہوا کہ نیویارک میں اتفاقی طور پر گیارہویں صدی سے اٹھارویں صدی تک کی نادر کتابوں، مخطوطات، تصاویر اور خطاطی کے نمونوں کا ایک بے بہا ذخیرہ ملا ہے۔ ایک صدی قبل یہ خزانہ پیرس کے ایک جوہری ہنری ویور نے جمع کیا تھا مگر دوسری جنگ عظیم کے دوران یہ ذخیرہ غائب ہوگیا اور اس کی گمشدگی کا یقین ہوگیا تھا لیکن بالآخر پچاس برس کے بعد اس کا سراغ ملا، تلاش جاری

رہی اور آخر کار کولمبس کے اخلاف نے اس خزانہ کو پالیا۔ چند مہینے قبل اس ذخیرہ کی تقریباً ڈیڑھ سو نادر تصاویر کی نمائش "نگاہ جوہر شناس، ویور کلکشن کی کتابوں میں اسلامی فن" کے نام سے کی گئی۔ ان میں شاہنامہ مکتوبہ ۱۴۲۵ء، ۱۴۹۳ء، ۱۴۹۳ء، فالنامہ ۱۵۵۰ء، خمسہ خسرو ۱۵۷۵ء، بابرنامہ ۱۵۸۹ء وغیرہ کی تصویریں قابلِ دید ہیں، فرخ بیگ کی بنائی ہوئی ایک ایسی تصویر ہے جس میں بابر ایک درباری کو شرفِ باریابی بخشتا ہے، یہ تصویر رنگوں کے حسین امتزاج کی وجہ سے شہپارہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہنری ویور کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جواہرات اور میناکاری اور مطلاّ و مذہّب مرصع سازی کی پرکھ میں ممتاز تھا، ان تصاویر میں خطوط کی ہمواری، رنگوں کی خوشنما ترکیب، مناظر کی پُرشکوہ ترتیب اس درجہ دلکش ہیں کہ ایک جوہر شناس کی نگاہ ضرور ہی ان پر پڑے گی۔ اس پورے ذخیرہ کو واشنگٹن کے اسمتھ سونین انسٹی ٹیوشن نے ۷۰ لاکھ ڈالر کے عوض میں خرید لیا ہے۔ علم و فن کے ان موتیوں کو یورپ و امریکہ میں دیکھ کر ہمارے دل سی پارے تو ضرور ہوتے ہیں مگر یورپ کی اس قدردانی کا ہم کو اعتراف بھی کرنا پڑتا ہے۔

بالآخر صداقت کا اعتراف ضرور کیا جاتا ہے، بلاسودی بینکنگ کا نظام کچھ عرصہ قبل لوگوں کے لئے ناقابلِ فہم تھا مگر اب اس کے فائدے کو تسلیم کیا جانے لگا ہے، ٹائمز آف انڈیا کا یہ تبصرہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ "ایران، سعودی عرب، ملیشیا اور پاکستان میں اسلامی بینک کاری کے بارے میں ہماری معلومات بہت کم ہیں، یہ بینک رقم جمع کرنے والوں کو سود نہیں دیتے اور قرضداروں سے اس کا مطالبہ نہیں کرتے، ورلڈ ڈیولپمنٹ رپورٹ (WDR) نے ایک جائزہ میں بتایا ہے کہ اسلامی بینک کاری کا سسٹم کامیاب ہو رہا ہے اور اب اسلامی بینک اس لائق ہیں کہ تجارت میں سرمایہ کو مختص کریں، مشارکت میں منافع پیشگی اندازوں کے لحاظ سے فرض کئے جاتے ہیں، ان بینکوں کا اس میں اہم حصہ ہوتا ہے وہ بھی منافع میں شریک ہوتے ہیں، مگر نقصان کی صورت میں کیا ہوگا؟ اسے کون برداشت کرے گا؟ اور حکومت کس طرح ضمانتیں اور ہنڈیاں فروخت کرے گی؟ سود کے بدلہ میں اگر رعایتی شرح پر تمسکات کا اجرا کیا جائے تو کیا اسے شریعت جائز قرار دے گی؟ ان سوالوں کا اطمینان بخش جواب مذکورہ رپورٹ میں نہیں ہے تاہم امر قابلِ لحاظ ہے کہ پاکستان میں بینک کاری کی مخصوص عدالتیں قائم کی گئی ہیں جو قرضداروں سے قرض کے حصول کو آسان بناتی ہیں"۔ تبصرہ نگار کو اس پر حیرت ہے کہ ہندوستان میں بھی یہ اسلامی بلاسودی نظام فروغ پا رہا ہے اور بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو بینکوں کے سود کی رقم یا تو خیراتی اداروں کو دے دیتے ہیں یا پھر ان کو قبول ہی نہیں کرتے۔

(ع ۔ ص)

ضروری تصحیح

جولائی ۱۹۸۹ء کے معارف میں مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کے نام مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا جو خط شائع ہوا ہے اس پر خود مولانا نے ۲۲ر اپریل ۱۹۴۳ء کی تاریخ تحریر کی ہے اور یہی معارف میں چھپ گئی، مگر واقعہ اس طرح ہے کہ جب ۸ر اگست ۱۹۴۲ء کو کانگریس نے بمبئی میں "ہندوستان چھوڑو" کی قرارداد منظور کی تو اگلی صبح متعدد دوسرے قومی رہنماؤں کے ساتھ وہ بھی گرفتار کر لئے گئے اور پھر جون ۱۹۴۵ء میں رہا ہو گئے ــــ مولانا نے اپنے مکتوبِ گرامی میں الٰہ آباد میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جس جلسہ کا ذکر کیا ہے وہ اپریل ۱۹۴۲ء کے آخر میں ہوا تھا۔ اس لئے خط تحریر فرمانے کی صحیح تاریخ ۲۲ر اپریل ۱۹۴۲ء ہوگی۔

مکتوبِ گرامی کے آخر میں جو شعر نقل ہوا ہے اس کا دوسرا مصرع غلط چھپا ہے، اس کی اس طرح تصحیح کر لی جائے۔

ع خوش بیا سائے زمانے کہ زماں ایں ہمہ نیست

آثارِ علمیہ و ادبیہ

ایک تاریخی تحریر۔ قطعۂ تاریخِ وفات علامہ شبلی نعمانیؒ

از

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، اسلام آباد، پاکستان

شمس العلماء علامہ شبلی نعمانیؒ کے انتقال کو ۷۵ برس ہو گئے۔ یہ قطعۂ تاریخ گردشِ لیل و نہار کے ہاتھوں ضائع ہونے سے اس لئے محفوظ رہا کہ ایک نہ ایک دن اسے علامہ کے شائقین اور قدر دانوں کی آنکھوں میں جگہ ملنی تھی۔ ۷۹ اور ۸۰ء میں ہندوستان کا میرا سفر چونکہ خالصتاً علمی مقاصد کے لئے تھا اس لئے اس سفر میں ہندوستان کے محافظین علم نے علمی نوادرات کے زر و جواہر سے پاکستانی مہمان کی جھولی بھر دی جسے اب میں "فتوحاتِ ہندیہ" کا نام دیتا ہوں۔ متعین طور سے اب یاد نہیں کہ فی الواقع یہ قطعۂ تاریخ مجھے کس نے دیا۔ گمانِ غالب یہی ہے کہ دائرہ حمیدیہ کے ڈائریکٹر مولانا بدرالدین اصلاحی نے جو نوادرات مجھے عطا کئے یہ انہیں میں تھا۔

علامہ شبلیؒ کا انتقال نومبر ۱۹۱۴ء میں ہوا۔ اس وقت مولانا فراہیؒ حیدرآباد پہنچ چکے تھے۔ حیدرآباد میں مولانا کے تقرر کی تاریخ ۳۰ر جون ۱۹۱۴ء ہے۔ یہ قطعہ حیدرآباد میں کہا گیا اور کہنے والا علامہ شبلیؒ اور مولانا فراہیؒ کا ہم وطن ہے۔ اس کے لئے اس کا مصرف اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ مولانا فراہیؒ کی خدمت میں پیش کرے جو مولانا شبلیؒ کے شاگرد بھی تھے اور قریبی عزیز بھی۔ وہ حیدرآباد میں ایک معزز منصب پر فائز تھے۔ اور فارسی شعر و ادب کا بہت اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔ یہ قطعہ حفیظ اللہ خاں کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہے۔ ان کے بارے میں اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ وہ اس قطعۂ تاریخ کے موزوں کرنے والے

ہیں اور اگر وہ اپنے نام کے ساتھ ہی اپنا کچھ پتا نشان بھی نہ لکھ دیتے تو میرے لئے یہاں بیٹھ کر آج اس کا کھوج لگانا بھی دشوار تھا۔ ان کا گاؤں سکرور اعظم گڈھ ضلع کا مشہور و ممتاز گاؤں ہے وہاں اس نام کے دو گاؤں ہیں۔ راجہ پور سکرور اور مغلن کے سکرور۔ یہ دونوں ہی گاؤں اعظم گڈھ شہر کی نسبت قصبہ سرائے میر کے زیادہ قریب ہیں۔ حفیظ اللہ صاحب نے اپنے نام کے ساتھ "سکروری" لکھا ہے۔ سکرور جب اکیلا لکھا اور بولا جائے تو اس سے مراد راجہ پور سکرور ہوتا ہے۔ یہ گاؤں قصبہ سرائے میر اور مدرسہ اصلاح کے شمال میں ۳۔۲ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ صاحب یقیناً ریاست حیدرآباد میں کسی اچھے عہدے پر فائز تھے۔ ان کی شاعرانہ صلاحیت اور تاریخ گوئی کا حال بھی سردست اس قطعے ہی پر موقوف ہے۔ میں نے مرحوم مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی سابق پروفیسر ادارۂ تحقیقات اسلامی سے جو اس فن کے پارکھ تھے پڑتال کرائی۔ انہوں نے حساب لگا کر بتایا تھا کہ تاریخ کا مادہ بالکل ٹھیک ہے۔ ذیل میں اس تاریخی تحریر کی ہو بہو نقل وادین میں درج کی جاتی ہے:۔

"قطعۂ تاریخ

وفات حسرت آیات علامہ لاثانی جناب مولانا شبلی نعمانی مرحوم مغفور

حسرتا وا حسرتا وا حسرتا

از جہاں فخرِ جہاں شبلی برفت

بہرِ تاریخِ وفاتِ او حفیظ

گفت رضواں۔ در جناں شبلی برفت

۱۳۳۲ھ

طبع زاد

خاکسار حفیظ اللہ خاں حفیظ سکروری اعظمگڈھی

مقیم حیدرآباد دکن"

بظاہر یہ حفیظ اللہ خاں حفیظ کی اپنی لکھی ہوئی تحریر ہے۔ اس کی ہر چیز سے تازگی نمایاں ہے کہنگی کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔

ادبیات

التجا

از

جناب فضا ابن فیضی صاحب مئو

سوادِ حرف ہوں، پیرایۂ معانی دے
مرے قلم کو سرو برگِ نکتہ دانی دے

نظر نظر کو عطا کر سرودِ بے آہنگ
نفس نفس کو مرے سازِ بے زبانی دے

مجھی کو سونپ دے تو اپنی حکمتیں ساری
ہوں لوحِ خاک تو کیا، نقشِ آسمانی دے

جو آئینہ ہے، شعورِ یقیں شناسی کا
مجھے وہ جوہرِ پندارِ خوش گمانی دے

اب اتنا خام نہیں، نشۂ جنوں میرا
جو سر دیا ہے، تو سودا کے سرگرانی دے

مرا سفینہ ہے بے موج و بے گہر، اس کو
صدف کا ظرف، سمندر کی بیکرانی دے

طناب و خیمہ کہاں، راہ میں شجر بھی نہیں
میں رختِ دشت سہی، دھوپ سایہ بانی دے

بہ نامِ جسم، یہ کیسی چٹان راہ میں ہے
رکا رکا ہے نفس، بحر کو روانی دے

بنا کے رکھ نہ مجھے، محض آب و گل کا طلسم
ذرا سے بھی، عناصر کی حکمرانی دے

گراں ہیں مجھ پہ، یہ طاق و واق و کوچہ و کاخ
مجھے مکاں نہ دے، دشتِ لامکانی دے

حصارِ کلفتِ نومیدی زبوں سے نکال
گستہ جاں کو، پرو بالِ کامرانی دے

جو اہلِ دل کے لئے، مایۂ قناعت ہے
مجھے وہ نفع زیاں، سودِ رائگانی دے

ہوس کشِ مزہ تو، یکم ماتگاں لذتِ درد
خراشِ زخم کو، ظرفِ نمک نشانی دے

کوئی گلاب نیا، میری شاخِ جاں پہ کھلا
کفِ گلاب کو پھر خارِ شادمانی دے

نیا مزاج عطا کر نگاہِ فطرت کو
خزاں کو، عشوۂ تہذیبِ باغبانی دے

اُفق اُفق سے، جو بے آفتاب روشن ہے
تو میری رات کو اس صبح کی نشانی دے

مجھے شجر دے، مری شاخ کو ثمر ور کر
ثمر کو ذائقۂ قندِ زندگانی دے

مجھے غرض، کسی بے روح داستاں سے کیا
تو جس کہانی میں شامل ہے وہ کہانی دے

رہوں، مطالعۂ کائنات و ذات میں گم
کتاب دی ہے تو ذوقِ کتاب خوانی دے

کہاں تلک میں قلم سے، لہو کشید کروں
مرے خدا! مری کشتِ ہنر کو پانی دے

غزل

از: جناب سید عروج زیدی مرحوم رام پور (یوپی)

سایۂ شاخِ گل ترین کے پاس آتے ہیں لوگ
رفتہ رفتہ دھوپ کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ

پرچمِ کردار اس خوبی سے لہراتے ہیں لوگ
وہ نہیں ہوتے ہیں جو ہم کو نظر آتے ہیں لوگ

ظلمتِ روشن "ترقی یافتہ سورج کی دین"
کیا اجالا ہے کہ جس میں ٹھوکریں کھاتے ہیں لوگ

اپنے دامن کو بنا رکھا ہے "تصویرِ بہار"
اس طرح دورِ خزاں میں دل کو بہلاتے ہیں لوگ

صرف لفظوں تک خلوصِ بیکراں محدود ہے
العجب ان کاغذی پھولوں پہ اتراتے ہیں لوگ

خاکِ راہِ دوست کے ذرے ہیں تابانی سرشت
گرد کا تو نام ہے تاروں میں چھپ جاتے ہیں لوگ

سنگ باری، ملامت عشق کی قسمت میں ہے
حسن ہو پیشِ نظر تو پھول برساتے ہیں لوگ

یہ سلوکِ رہبری کا آئینہ دیکھو عروج!
راہ میں خود اپنے سائے سے بھی ڈر جاتے ہیں لوگ

مطبوعاتِ جدیدہ

ائمہ اربعہؒ مرتبہ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۲۵۶ مجلد، قیمت درج نہیں، ناشر شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند۔

مصنف کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے، سیرو تذکرہ اور ہندوستان کی اسلامی تاریخ پر انکی تقریباً ایک درجن بلندپایہ اور مستند کتابیں شائع ہوچکی ہیں، ائمہ اربعہؒ ان کی نئی تصنیف ہے، اس میں معتبر کتابوں اور مستند مآخذ سے امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے حالات، علمی و دینی خدمات اور دوسرے کارناموں کا مرقع پیش کیا گیا ہے، شروع میں اسلامی فقہ کی تاریخ و تدوین اور ترتیب پر مختصر مگر مفید بحث ہے پھر ائمہ کرامؒ کا تذکرہ ہے جس میں ہر ایک کے خاندانی حالات، تحصیل علم، اساتذہ و طلبہ، فضل و کمال، فقہ و اجتہاد، زہد و اتقا، عبادت و ریاضت، اخلاق و عادات، تصنیفات، حکیمانہ اقوال، وفات اور اولاد و احفاد کا ذکر ہے، اردو میں چاروں ائمہ پر مستقل کتابیں موجود ہیں اس کتاب میں ان سب کے حالات یکجا کر دیے گئے ہیں اور فقہی و علمی مسائل سے اس لئے تعرض نہیں کیا گیا ہے تاکہ عام مسلمانوں کے لئے بھی اس سے استفادہ آسان اور سہل ہو۔

مقالاتِ صدیقی پہلا حصہ از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرتبہ جناب مسلم صدیقی، تقطیع متوسط، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۴۰ مجلد، قیمت ۱۵ روپے، ناشر اتر پردیش اردو اکادمی، قیصر باغ لکھنؤ۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم اردو کے صفِ اوّل کے محقق اور متعدد زبانوں کے ماہر تھے لیکن مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بقول "خیام کی طرح علم میں بخیل اور قلم کو بہت کم حرکت دیتے تھے" اس لئے ان کے تحریری نقوش قلیل ہیں تاہم یہ علمی، ادبی، تنقیدی، تحقیقی اور لغوی حیثیت سے بڑے اہم اور بلند پایہ ہیں، اب

ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادے جناب مسلم صدیقی نے مختلف رسالوں میں ان کے بکھرے ہوئے مضامین کا یہ پہلا حصہ اتر پردیش اردو اکادمی سے شائع کیا ہے جو ڈیڑھ درجن مضامین پر مشتمل ہے، ڈاکٹر صاحب کو اردو املا اور صرف و نحو کے قواعد و مسائل کی ترتیب و انضباط اور الفاظ کی تحقیق و تدقیق سے جو شغف رہا ہے یہ مضامین اس کا مظہر ہیں، پہلے مضمون میں اردو املا کے قواعد منضبط کرنے کی ضرورت واضح کی ہے، اس سلسلہ میں بعض حرفوں اور لفظوں کے تلفظ و املا پر بھی فاضلانہ بحث کی ہے، ایک اور مضمون میں اردو صرف و نحو کی کم مائیگی دکھانے کے بعد اس کے اصول مرتب کئے جانے پر زور دیا ہے اور اس بارے میں بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے، اردو میں ضمائر مفعولی اور احوال اسم کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں پوراحق تحقیق ادا کیا گیا ہے، ایک مضمون میں تماہی کی ترکیب کو صحیح قرار دیا ہے اور اس ضمن میں یہ بھی بتایا ہے کہ اردو فارسی اجزا کی آمیزش کب اصول کے خلاف ہوتی ہے، ایک مضمون میں اس پر محققانہ گفتگو کی گئی ہے کہ ہندوستان کا املا ہندستان بغیر واؤ درست ہے اور اس پر اعتراض کرنے والوں کا جواب دیا ہے، ایک اور مضمون میں مدلل بحث کر کے جزو کے بجائے جز کو صحیح املا قرار دیا ہے، مرزا غالب مرحوم کے نزدیک فارسی زبان میں ذال معجمہ نہیں ہے، ایک مضمون میں اس کی دلائل سے تردید کی گئی ہے ــــ مندرجہ ذیل مضامین پرانے لفظوں کی نئی تحقیق، بغداد کی وجہ تسمیہ، افسوس (لفظ کا ایک بھولا ہوا مفہوم)، معرب لفظوں میں حرف ق کی حیثیت، لفظ سفر کی تحقیق بھی ڈاکٹر صاحب کی کد و کاوش اور لغوی تحقیق کا نمونہ ہیں، آخر کے مضامین میں بعض کتابوں کا ذکر ہے جو یہ ہیں دَنی کی زبان، وضع اصطلاحات پر تبصرہ، معائب سخن کلام حافظ کے آئینے میں اور اصلاح سخن پر تبصرہ، یہ سب بھی ڈاکٹر صاحب کی ناقدانہ اور محققانہ بصیرت کا ثبوت ہیں۔ یہ مضامین جس زمانہ میں لکھے گئے تھے اس وقت ان پر کافی بحث رہی اور اب بھی ممکن ہے بعض خیالات سے اختلاف کیا جائے۔ تاہم ڈاکٹر صاحب کی اکثر تحقیقات اور ان مضامین کی قدر و قیمت کو تسلیم کیا جانے لگا ہے، ان سے محققین اور زبان دانوں

کے طلبہ کو بڑی رہنمائی ملے گی. مگر ڈاکٹر صاحب کی کوتاہ قلمی کا اثر دیباچہ اور سوانحی خاکہ پر بھی پڑا ہے، کاش ان کے حالات و سوانح کسی قدر تفصیل سے لکھے گئے ہوتے۔

کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں | مرتبہ جناب مالک رام صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۲۲۴ مجلد، قیمت ۵۱ روپے، پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

اردو کے مشہور محقق جناب مالک رام صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم پر وقتاً فوقتاً جو مضامین لکھے تھے، یہ کتاب ان کا اور بعض نئے مضامین کا مجموعہ ہے جن کی تعداد گیارہ ہے، ان میں مولانا کی سیرت و شخصیت اور حالات و کمالات کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے، سب سے پہلے تو ان کی ولادت کے صحیح ماہ و سال اور تاریخ کا تعین کیا گیا ہے، پھر ان کی زندگی کے ابتدائی بیس برسوں (الہلال سے پہلے) کے حالات و واقعات قلمبند کئے گئے ہیں، اس میں ان کے خاندانی حالات، تعلیم و تربیت، شعر و سخن سے دلچسپی اور علمی، تعلیمی اور تحریری و تصنیفی سرگرمیوں پر گفتگو کی گئی ہے. تین مضامین میں صحافت و خطابت میں مولانا کے کمالات اور اردو پر ان کے احسانات دکھائے گئے ہیں، ایک طویل مضمون میں ملک و قوم کی آزادی کے لئے مولانا کی سرفروشانہ جد و جہد کا تذکرہ ہے، اس میں خصوصیت سے یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید ہمیشہ سے مولانا کے غور و فکر کا خاص محور رہا ہے جس کے نتیجہ میں انہوں نے ملکی سیاست اور تحریکِ آزادی کے لئے مذہبی بنیادیں قائم کرنے کا کام انجام دیا. اس مضمون کے بعض مندرجات میں بحث کی گنجائش ہے۔ ایک مضمون میں مرزا غالب اور مولانا آزاد کی زندگی میں مماثلت کے چند دلچسپ پہلو دکھائے ہیں. مولانا آزاد کی مشہور تصانیف غبارِ خاطر اور تذکرہ کو ایڈٹ کرکے محققانہ حواشی کے ساتھ شائع کرنے کا سہرا مصنف ہی کے سر ہے، ان کتابوں کے جو مقدمے انہوں نے لکھے تھے، وہ بھی اس کتاب کی زینت اور اہمیت کے حامل ہیں، ایک مضمون میں ان امور کی نشاندہی کی ہے جن پر مولانا کے سلسلے میں ابھی کام کرنے کی ضرورت ہے،

آخری مضمون میں مولانا کے بڑے بھائی مولوی ابوالنصر غلام یٰسین آہ کا تذکرہ لکھنے کے بعد ان کا کلام درج کیا ہے، بعض مضامین میں مولانا کے بارے میں غلط فہمیوں کو اچھے انداز میں رفع کیا گیا ہے، شروع کے مقدمہ میں مصنف نے مولانا سے اپنے تعلق اور مختلف ملاقاتوں کا حال بیان کیا ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں، اس میں ایک جگہ ماہر القادری مرحوم کے ایک مخالفانہ بلکہ گستاخانہ مضمون کا ذکر بھی آگیا ہے جو ان کے ماہنامہ فاران میں شائع ہوا تھا، اس مضمون کے جس خاص محرک کا بہت ناگواری سے ذکر کیا گیا ہے اس کا کوئی ثبوت نہیں دیا ہے. یہ مضامین مختلف وقتوں میں لکھے گئے ہیں اور ان میں مولانا کی جو سرگرمیاں زیرِ بحث آئی ہیں وہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں اس لئے ان میں تکرار ہے جس کے لئے خود مصنف نے معذرت کی ہے، مکتبہ جامعہ نے یہ کتاب اپنی روایتی شان کے مطابق عمدہ شائع کی ہے مگر اس میں کتابت و طباعت کی بعض غلطیاں ہیں. مولانا آزاد کی زندگی اور کارناموں کو جاننے اور سمجھنے کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔

اقوال سلف حصہ دوم | مرتبہ مولانا محمد قمر الزماں صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۳۶۰ مجلد، قیمت ۴۰ روپے. ناشر مکتبہ دار المعارف الہ آباد۔

مولانا قمر الزماں صاحب نے اس دور کے دو مشہور شیوخ طریقت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ اور مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی کی رہنمائی میں سلوک و تصوف کے مراحل طے کئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو تصنیف و تالیف کا بھی ذوق عطا کیا ہے، جس کا موقع وہ درس و تدریس کی مشغولیت کے باوجود نکال لیتے ہیں اور اپنی نگارشات سے دوسروں کو فیض یاب کرتے ہیں، اس سے قبل ان صفحات میں ان کی تصنیف لطیف اقوال سلف حصہ اول کا ذکر آچکا ہے. یہ کتاب اس کا دوسرا حصہ ہے اس میں بھی اصلاً حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ کی کتاب الطبقات الکبریٰ کی مدد سے سلفِ صالحین کے موثر اور عبرت خیز نصائح و فرمودات اور اخیار و ابرار کے سبق آموز حالات و واقعات

اور پاکیزہ اقوال وملفوظات جمع کئے گئے ہیں۔ اس ضمن میں جا بجا جامع ومرتب نے اس موضوع کی دوسری کتابوں سے بھی بہت سی حکیمانہ باتیں نقل کی ہیں پھر ان پر جو فوائد وحواشی تحریر کئے ہیں وہ بھی دل آویز اور اثر انگیز ہیں، پہلے حصہ میں ابتدا سے تیسری صدی ہجری کے نصف اوّل تک کے مشائخ کے ملفوظات وارشادات جمع کئے گئے تھے، زیر نظر حصہ میں اس کے بعد سے دسویں صدی تک کے اولیاء وعلماء کے اقوال کو اردو کا جامہ پہنایا گیا ہے جن کو پڑھنے میں بڑی لذت و حلاوت ملتی ہے۔

جوہر قابل | از جناب مسعود احمد برکاتی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۴۸ قیمت ۷ روپے۔ پتہ ہمدرد فاونڈیشن پریس، ناظم آباد۔ کراچی۔ پاکستان۔

جناب مسعود احمد برکاتی ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی کے شعبۂ تحقیق وتصنیف کے نگراں اور تصنیف وتالیف کا خاص ذوق رکھتے ہیں، زیر نظر کتاب میں انہوں نے کم عمر اور کم استعداد لوگوں کے لئے مشہور قومی وملی رہنما مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے حالات وکمالات کا مرقع پیش کیا ہے۔ گو مولانا کے حالات اور کارناموں کا دائرہ بہت وسیع اور گوناگوں ہے مگر برکاتی صاحب نے دریا کو کوزے میں سمو دینے کی کامیاب کوشش کی ہے، مختصر ہونے کے باوجود یہ کتاب جامع اور سہل وسلیس زبان کی وجہ سے دلچسپ بھی ہے۔

متاعِ محبوب | از جناب محبوب پاشا صاحب۔ تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی صفحات ۹۸ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۲ روپے۔ پتے (۱) گوہر بکڈپو، قائد ملت روڈ مدراس ۵ (۲) موڈرن پبلشنگ ہوز، گولا مارکیٹ دہلی

جناب محبوب پاشا مدراس کے ایک مقبول ومحبوب شخص اور خوش مذاق شاعر ہیں، ان کو اردو زبان سے عشق ہے اس لئے مدراس میں رہنے کے باوجود انہوں نے اسی کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا ہے۔ وہ نظم ونثر دونوں اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اس مجموعہ میں غزلوں کے علاوہ نظمیں ونعتیں بھی شامل ہیں، امید ہے ان کا کلام مقبول ہوگا۔

"ض"

تصنیفات مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۱. سیرۃ النبی جلد سوم۔ معجزہ کے امکان و وقوع پر علم کلام اور قرآن مجید کی روشنی میں مفصل بحث۔ قیمت ۵۸/=

۲. سیرۃ النبی جلد چہارم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ فرائض۔ ۵۸/=

۳. سیرۃ النبی جلد پنجم۔ فرائض خمسہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد پر سیر حاصل بحث۔ ۴۸/=

۴. سیرۃ النبی جلد ششم۔ اسلامی تعلیمات، فضائل ورذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل۔ ۵۸/=

۵. سیرۃ النبی جلد ہفتم۔ معاملات پر مشتمل متفرق مضامین ومباحث کا مجموعہ۔ ۲۳/=

۶. رحمت عالمؐ۔ مدرسوں اور اسکولوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کیلئے سیرت پر ایک مختصر اور جامع رسالہ۔ ۷/=

۷. خطبات مدراس۔ سیرت پر آٹھ خطبات کا مجموعہ جو مسلمانان مدراس کے سامنے دیے گئے تھے۔ ۱۶/=

۸. سیرت عائشہؓ۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات ومناقب وفضائل۔ ۲۵/=

۹. حیات شبلیؒ۔ مولانا شبلیؒ کی بہت مفصل اور جامع سوانح عمری۔ ۵۸/=

۱۰. ارض القرآن ج ۱۔ قرآن میں جن عرب اقوام وقبائل کا ذکر ہے ان کی عصری اور تاریخی تحقیق۔ ۲۴/=

۱۱. ارض القرآن ج ۲۔ بنو ابراہیم کی تاریخ قبل از اسلام، عربوں کی تجارت اور مذاہب کا بیان۔ ۱۸/=

۱۲. خیام۔ خیام کے سوانح وحالات اور اس کے فلسفیانہ رسائل کا تعارف۔ ۴۵/=

۱۳. عربوں کی جہاز رانی۔ بمبئی کے خطبات کا مجموعہ۔ ۱۵/=

۱۴. عرب وہند کے تعلقات۔ ہندوستانی اکیڈمی کے تاریخی خطبات (طبع دوم عکسی) ۳۹/=

۱۵. نقوش سلیمانی۔ سید صاحب کے منتخب مضامین کا مجموعہ جن کا انتخاب خود موصوف نے کیا تھا (طبع دوم عکسی) ۴۲/=

۱۶. یاد رفتگاں۔ ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر کے انتقال پر سید صاحبؒ کے تاثرات ۳۳/=

۱۷. مقالات سلیمان (۱) ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ۔ ۳۳/=

۱۸. مقالات سلیمان (۲) تحقیقی اور علمی مضامین کا مجموعہ۔ ۲۹/=

۱۹. مقالات سلیمان (۳) مذہبی وقرآنی مضامین کا مجموعہ (بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں) ۲۹/=

۲۰. بریدِ فرنگ۔ سید صاحبؒ کے یورپ کے خطوط کا مجموعہ۔ ۲۰/=

۲۱. دروس الادب حصہ اول ودوم۔ جو عربی کے ابتدائی طالب علموں کے لیے مرتب کیے گئے ۴/= ۶/=

"منیجر"